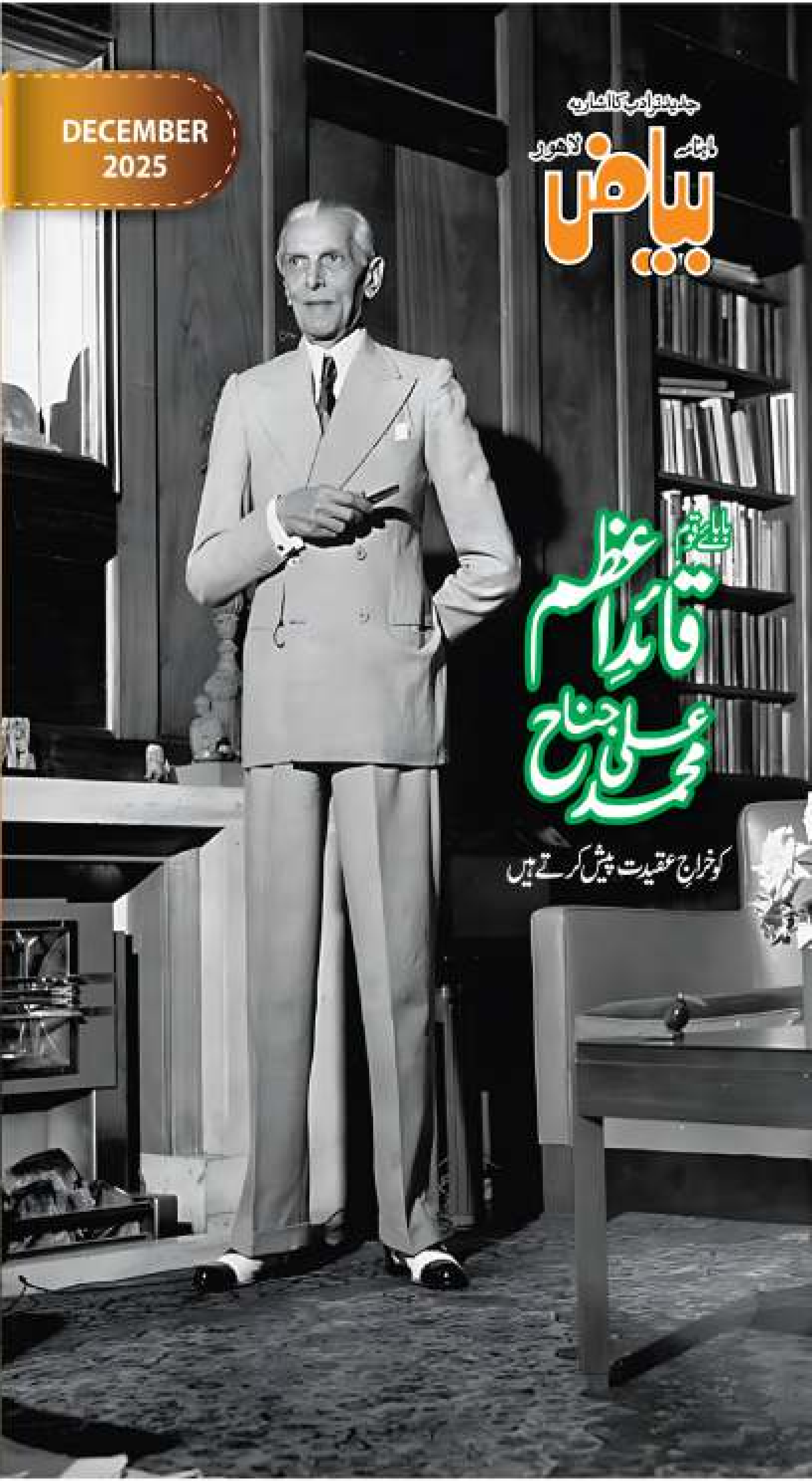
DECEMBER
2025
ماہنامہ
لاہور
بیاض
بابائے قوم
قائدِ اعظم
محمد علی جناح
کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں

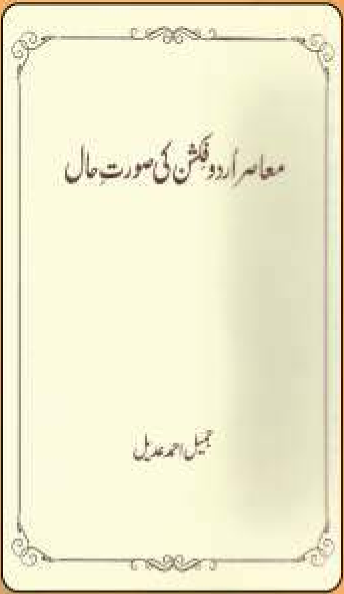
معاصر اردو فکشن کی صورتِ حال
جمیل احمد عدیل

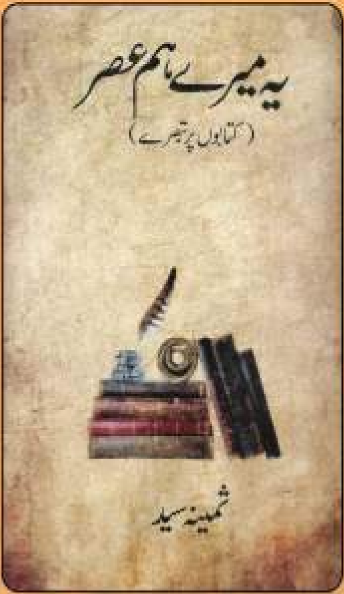
یہ میرے ہم عصر
(کتابوں پر تبصرے)
ثمینہ سید

نیویارک... چودہ قدم
شبہ طراز

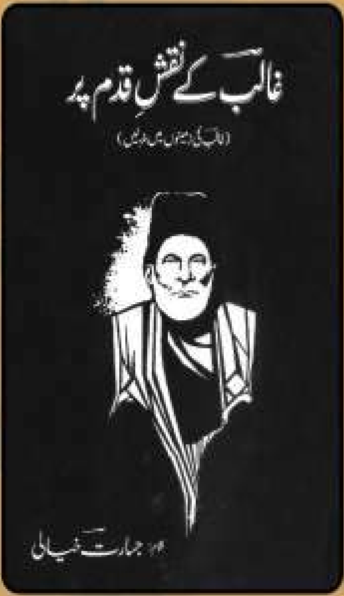
غالب کے نقشِ قدم پر
جسارت خیالی

غزل

[اختر حسین جعفری کے لیے]

ترا ہم خیال ہونا، ترا ہم ملال ہونا
ترے فن میں غم نے سیکھا غمِ لازوال ہونا

ہمیں یوں نہ راس آیا کہ فلک نہ دیکھ پایا
ترا ہم نشین ہونا، ترا ہم جمال ہونا

نکل آئے تیری دھج سے، ترے آنسوؤں میں سج کے
ہمیں راس آ نہ جائے، ترا ہم کمال ہونا

ترے بعد کہہ رہے ہیں کہ یہ کرب سہہ رہے ہیں
شبِ ہجر کس سے سیکھے سحرِ وصال ہونا

کفِ پا نہ دھر سکیں گے، ترے نقشِ پا تکیں گے
ہنر آزما رہے گا، ترا بے مثال ہونا

ترِ سطر جاتے جاتے، ترے غم تک آتے آتے
لبِ انگبیں نے سیکھا، نمکیں مقال ہونا

تجھے دیکھ کر بڑھیں گے، تجھے پڑھ کے پھر پڑھیں گے
کہ ترے سخن کو آیا، سخنِ شمال ہونا

ترا ہم زبان کر دے، ترا ہم نشان کر دے
درِ پنجتن پہ اپنا ہمہ تن سوال ہونا

ترے حرف میں ضیا ہے، ترا فن جہت نما ہے
رخِ یار جلوہ آرا پسِ ماہ و سال ہونا

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 37030901-9
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5252311 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - دسمبر 2025 - شمارہ نمبر: 12

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: قائداعظم محمد علی جناح

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور پرنٹر پبلشر اور چیف ایڈیٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد فارمیسی کلنک اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِی فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، شوکت محمود شوکت سرور حسین نقشبندی	7 تا 10
2	نعت	محمد یٰسین قمر، رضا اللہ حیدر، اکرم ناصر، محمد اقبال انجم احمد جلیل، سرور حسین نقشبندی، جمشید کمبوہ، شفیق بیگ چغتائی	11 تا 18
3	نعتیہ قطعات	نسیم سحر	19
4	عقیدت	فیض رسول فیضان، مرزا آصف رسول، نبیل احمد نبیل ریاض ندیم نیازی	20 تا 23
5	رباعیات	سعید اشعر، گلزار بخاری، محمد نصیر زندہ	24 تا 27
6	افسانے	انور خواجہ، بلقیس ریاض، آسناتھ کنول، کومل شہزادی وسیم جبران، عامر عباس ناصر اعوان	28 تا 66
7	شکر کی چھاؤں [ناولٹ]	صفورا پرویز	67 تا 76
8	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، سید ریاض حسین زیدی نسیم سحر، گلزار بخاری، خاور اعجاز، یعقوب پرواز، راحت سرحدی نثار ترابی، قیوم طاہر، محمد انیس انصاری، اکرم ناصر رضا اللہ حیدر، عقیل رحمانی، اجمل اعجاز، احمد جلیل، خالدہ انور	77 تا 138

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	افروز رضوی، افتخار شاہد، انصر حسن، اوصاف شیخ، ریاض ندیم نیازی، عابد خان عابد، عاصم اعجاز، اعجاز دانش، محمد سلیم ساگر، اقبال ناظر، طارق بٹ، اصغر علی بلوچ، تنویر قاضی، سلیم نگار، افضل ہزاروی، انوار انجم، احمد ساقی، نبیل احمد نبیل، امر مہکی، اکرم جاذب، قمر نیاز، شبیر نازش، نائمہ راٹھور، افتخار الحق، سید طاہر شیرازی، محمد افضال انجم، میتھیو محسن، سمیع اللہ عرفی، فیض رسول فیضان، نبیل قیصر، اقبال سروبہ، محمد نوید مرزا، ارشد محمود ارشد، الیاس شبی، نعیم عباس، راجہ عبدالقیوم، امجد خان تجوانہ، جیا قریشی، نعمان محمود، ندیم ملک، حسن پرویز سید، خالق آرزو، مستحسن جامی، دلشاد نظمی	77 تا 138
9	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، اسلام عظمی، آفتاب خان، سعید اشعر، شاہ روم خان ولی، مسعود تنہا، لبنیٰ صفدر، صدام ساگر، افتخار الحق، نیر سرحدی، خالق آرزو، منیر مانک	139 تا 191
10	حلقۂ دامِ خیال [سفرنامہ]	اقبال خان یوسف زئی	192 تا 201
11	طنز و مزاح خاکہ	نور کمال شاہ، جمیل احمد عدیل، اعجاز رضوی	202 تا 216
12	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، نسیم سحر، سید افسر ساجد، محمد انیس انصاری، طالب انصاری، امجد بابر، فیاض تحسین، تنویر قاضی، سید فرخ رضا ترمذی، اکرم ناصر، فیض رسول فیضان، نائلہ راٹھور، علمدار حسین، لبنیٰ صفدر، سید طاہر شیرازی، نیب سلطان بیا، احمد ساقی، نگہت اکرم، محمد عبداللہ، بشریٰ شیریں، جنید آذر	217 تا 241

حمد

لفظ کے ساتھ نیا لفظ مِلا دیتا ہے
وہی تو ہے جو مری بات بنا دیتا ہے

اہلِ ثروت کا نہیں آسرا درکار مجھے
میری حاجت سے کہیں بڑھ کے خدا دیتا ہے

دل میں رہنے نہیں دیتا کبھی دُنیا کا خیال
نقش جیسے ہی بنے اس کا، مِٹا دیتا ہے

ہم نے اِس واسطے وجدان سے اُس کو مانا
عقل والوں کے تو وہ ہوش اُڑا دیتا ہے

کیسے کیسے نہیں کرتا ہے وہ پھر دل جوئی
ہم فقیروں کا کوئی دِل جو دُکھا دیتا ہے

مجھے لے جاتا ہے جو مکّے مدینے، گویا
وہ یہیں پر مجھے جنت کی ہَوا دیتا ہے

اپنے پلّے سے تو کوئی نہیں کچھ دے سکتا
جو بھی دیتا ہے وہ اُس کا ہی دیا دیتا ہے

شامیانہ ہے نہ مسند ہے نہ تکیہ کوئی
شکر کرتا ہُوں کہ وہ اِن سے سوا دیتا ہے

غم ہے خاورؔ تجھے کیا بے سر و سامانی کا
جب وہ اچھی بسر اوقات کرا دیتا ہے

خاور اعجاز

حمد

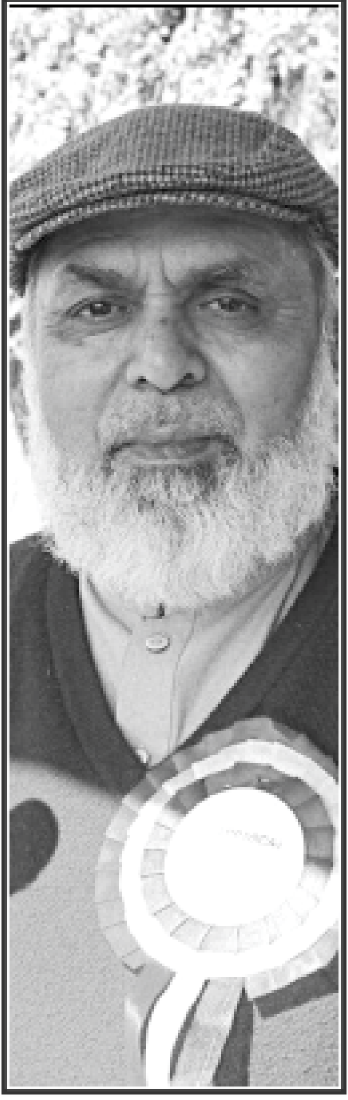

سارے جہاں میں اُس کا ہی سکّہ چلتا ہے
سب معبود ہیں جھوٹے، ایک وہی سچا ہے

کون بنا سکتا ہے سُورج اُس کے جیسا
کون فلک سے ایک ستارہ لا سکتا ہے

اُس کے "کُن" کہہ دینے سے، یعنی "ہو جا"
چشمِ زدن میں جو وہ چاہے، ہو جاتا ہے

اُس سے کہیں بھی، کچھ بھی نہیں ہے پوشیدہ
اُسے خبر ہے، کون، کہاں، کیا سوچ رہا ہے

وہ موجود تھا، جب کچھ بھی موجود نہیں تھا
ہر اک شے فانی ہے، اُس کے لیے بقاء ہے

سارے زمانے یہی گواہی دینے آئے
وہی بڑا ہے، وہی بڑا ہے، وہی بڑا ہے

سارے اچھے اچھے نام ہیں صرف اُسی کے
صرف اُسی کو زیبا، ہر توصیف و ثنا ہے

محمد انیس انصاری

حمد

تراذکر دل کا سکون ہے، ترا نام دل کی حیات ہے
تری حمد وردِ زباں رہے، کہ یہی تو قند و نبات ہے

مجھے ماسوا ترے عشق کے، کسی شے کی کچھ بھی خبر نہیں
ترے عشق ہی سے بقا مری، ترے عشق ہی سے ثبات ہے

مجھے نار و نور سے کیا غرض، کسی کوہ طور سے کیا غرض
ترے جلوے ہیں مرے ہر طرف چار سو، مرے روبرو تری ذات ہے

مرے مولا تو ہے کریم بھی، مرے مولا تو ہے رحیم بھی
مجھے خوفِ دنیا و حشر کیوں، میرے سر پہ تیرا جو ہات ہے

یہ عبادتیں یہ ریاضتیں، تری بارگہ میں قبول ہوں
مری آرزو ہے فقط یہی، مرے دل کی ایک ہی بات ہے

شوکت محمود شوکت

----------- انتخاب -----------

- خالد احمد -

------- نعمان منظور -------

اک مذلّت نشیں تھے ہم ہی یہاں
کوئی خاقان تھا، کوئی قاچار

حمد

بخت ایسے ہوں ہرے ، اللہ کرے
ذکر سے دامن بھرے ، اللہ کرے

اس کے بندے کو ہو بس اس کی لگن
صرف اس سے ہی ڈرے ، اللہ کرے

حمد لکھوں ہر ستائش کے بغیر
لفظ کھوٹے ہوں کھرے ، اللہ کرے

صرف اس کی ہو لگن اس کا خیال
ہر تعلق ہو پرے ، اللہ کرے

لاالہ کا ورد ہو لب پہ رواں
کاش سرور جب مرے ، اللہ کرے

سرور حسین نقشبندی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

دیکھتا کون ایک پل رُک کر
رقصِ یارانِ بے سر و دستار

نعتؐ

نبیؐ کے شہر سے اک خواب جو جُڑا ہوا ہے
نگینہ جیسے انگوٹھی میں اک جُڑا ہُوا ہے

تصوّرات میں عہدِ نبیؐ کے جلوے ہیں
خیال و فکر کا گلدان کیا سجا ہوا ہے

اسے حضورِ رسالت مآبؐ بہنا ہے
وہ سیلِ اشک جو پلکوں پہ ہی رُکا ہوا ہے

درِ نبیؐ سے میں لوٹا ہوں جھولیاں بھر کر
میں کیا بتاؤں کہ کیا کچھ مجھے عطا ہوا ہے

میں جب سے گنبدِ خضرا کو دیکھ آیا ہوں
خیال شکر کے سجدے میں ہی پڑا ہوا ہے

ثمر ہے آپؐ کی چشمِ کریم کا سارا
یہ دل حوادثِ دنیا سے گر بچا ہوا ہے

ملی ہے نور کی خیرات ماہِ طیبہ سے
اسی لیے مرا کشکول اب بھرا ہوا ہے

بہار صلّ و سلّم کا معجزہ دیکھو
خزاں نصیب شجر کس طرح ہرا ہوا ہے

یہ کس کی یاد کے غنچے کھلے ہیں دل میں
قدم قدم پہ جو گلزار سا کھلا ہوا ہے

قمر نبیؐ کی ہے چاہت کا تب روا دعویٰ
سرشکِ توبہ سے دامن اگر دھلا ہوا ہے

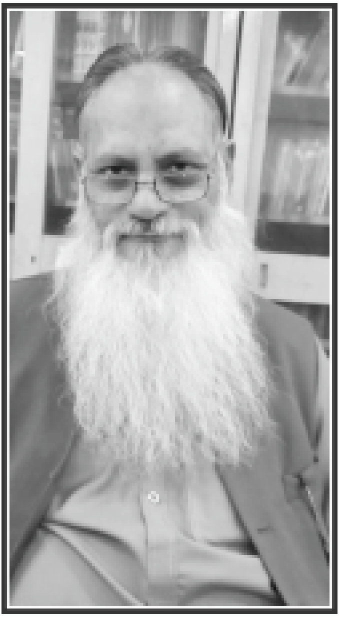

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

مدینے سے جو لوٹے ہیں نظارے ساتھ لائے ہیں
نبی کی پاک چاہت کے ستارے ساتھ لائے ہیں

مقامِ مصطفیٰ کی رفعتوں کو ماننے والے
لحد میں اپنی بخشش کے سہارے ساتھ لائے ہیں

شفاعت مصطفیٰ کی ہو گئی جن کے لیے واجب
وہی تو عفو و رحمت کے اشارے ساتھ لائے ہیں

فضائیں جن میں جبریل امین کا آنا جانا تھا
وہیں سے فیض کے پرنور دھارے ساتھ لائے ہیں

رہا آلودہ دامن شرک سے اور کفر سے جن کا
جہنم کے وہ سب باسی، شرارے ساتھ لائے ہیں

مجھ کو رضا روتے ہوئے دیکھا ہے یوں جیسے
مدینے میں بہانے اشک سارے ساتھ لائے ہیں

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشم تر گیا تھا

نعتؐ

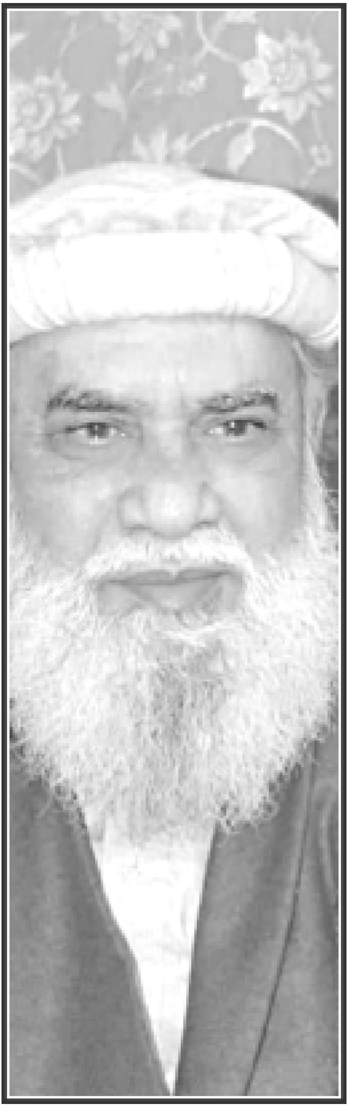

اکرم ناصر

یقین مان کوئی اور کام ہے ہی نہیں
سوائے نعتِ نبی صبح و شام ہے ہی نہیں

پہاڑ وادیٔ طائف کو پیس دیتے مگر
حضور میں تو خوئے انتقام ہے ہی نہیں

تھے منتظر سبھی اقصیٰ پہ انبیاء و رسل
سوائے آپ کے ان کا امام ہے ہی نہیں

کہا حضور نے جائے اگر تو لے جاؤ
یہ میرا بیٹا ہے بیٹا غلام ہے ہی نہیں

کسی بھی سوچ میں آیا نہیں خدا کی شان
کسی کا آپ سے پہلے یہ نام ہے ہی نہیں

درود پڑھتا ہوں ہر وقت اور کرتا ہوں
وہ کام جس کا کوئی اختتام ہے ہی نہیں

نعتؐ

یہ زمیں آپؐ کی آسماں آپؐ کا
اب ہے محشر تلک ہر زماں آپؐ کا

آپؐ رحمت لقب دو جہاں میں ہوئے
سر پہ کس کے تھا سائباں آپؐ کا

فتح و نصرت نے چومے ہیں آکر قدم
جس طرف بھی گیا کارواں آپؐ کا

آپؐ جیسا کوئی جب نہ پیدا ہوا
پھر مماثل ہو کوئی کہاں آپؐ کا

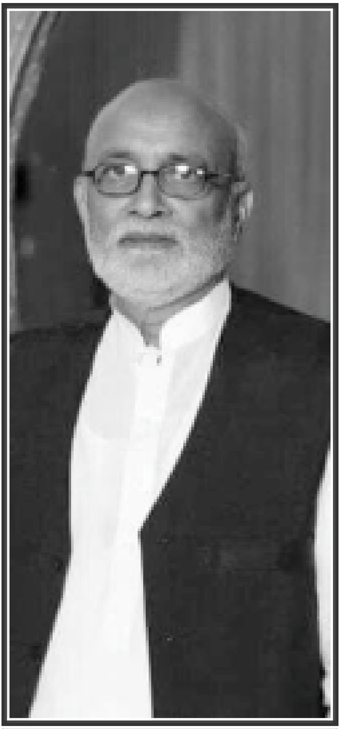

ایسے اخلاق لے کر حضورؐ آئے ہیں
دل میں اُترے ہے حرف و بیاں آپؐ کا

جس کی کوئی مثال اس جہاں میں نہیں
اتنا اعلیٰ نسب خانداں آپؐ کا

ہر کوئی انؐ پہ قربان ہونے کو ہے
ہے ہر اک دل میں درد نہاں آپ کا

بن کے آئے ہیں ہر بے زباں کی زباں
ہو نہ مشکور کیوں بے زباں آپؐ کا

محمد افضال انجم

نعتؐ

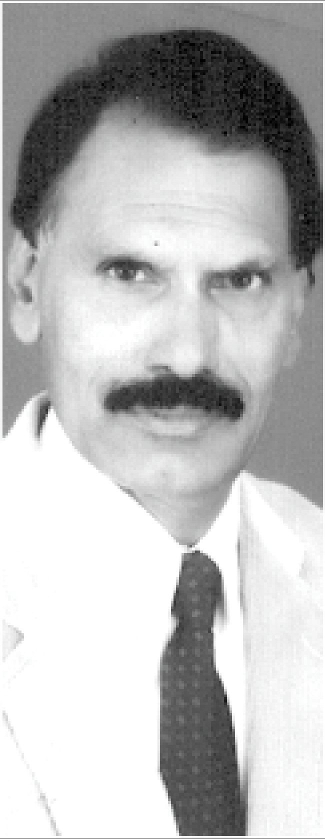

احمد جلیل

سوچ چمکی ترے حوالوں سے
پھول جھڑنے لگے خیالوں سے

عشقِ احمد میں گزرے جو لمحہ
قیمتی ہے ہزار سالوں سے

کملی والے ہیں خود مثال اپنی
وہ مبرا ہیں سب مثالوں سے

کہکشاں، مہر و مہ کواکب سب
ہیں درخشاں ترے اجالوں سے

لمحے، دن، سال، قرن اور صدیاں
سب ہیں روشن ترے حوالوں سے

آمدِ مصطفیٰ کی خوشیاں تو
یوں ہی جاری ہیں صدیوں سالوں سے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بس اک کھٹکا، بس اک دھڑکا
یاد نہ رکھ لیں، بھول نہ جائیں

نعتؐ

حرف اشکوں سے بُنے اور سجائیں نعتیں
کچھ نئے رنگ سے آنکھوں نے سنائیں نعتیں

مجھ کو اک لمس کی تاثیر ہوئی ہے محسوس
چوم کر میں نے جو آنکھوں سے لگائیں نعتیں

زندگی میں جو حرارت ہے انھی کے دم سے
یوں لہو بن کے رگ و پے میں سمائیں نعتیں

کچھ تو ایسی ہیں جو تحریر بھی ہو سکتی نہیں
وہی پلکوں کے جھروکوں میں چھپائیں نعتیں

سننے والوں کو مہک ان میں نہ کیسے آئے
آپ کے شہر کی خوشبو میں نہائیں نعتیں

آج بھی یاد جب آئے تو مہک جاتا ہوں
کس خرابے سے مجھے کھینچ کے لائیں نعتیں

خوب سرشار کیے رکھتی ہیں سرور مجھ کو
میں نے جو خالد و تائب کو دکھائیں نعتیں

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

عقیدتوں کے بنا کے گجرے ، بڑی محبت سے تک رہے ہیں
مرے نبی کے غلوِ عظمت کو لوگ حیرت سے تک رہے ہیں

رسولِ رحمت کے دم قدم سے ''دمک رہے ہیں'' ملول چہرے
رسولِ رحمت ، ملول چہروں کو چشمِ رحمت سے تک رہے ہیں

الوہی ''نطقِ محمدی پر'' سخن وروں کو ہے اک تعجب
کوئی فصاحت سے تک رہے ہیں، کوئی بلاغت سے تک رہے ہیں

مٹا دیے ہیں وداعی خطبے نے گورے کالے کے فرق سارے
'' رعونتِ رنگ ونسل کے بُت ، کمال حیرت سے تک رہے ہیں''

بنائے کِبر و بُتِ تفاخر کو شاہِ دیں نے اُکھاڑ پھینکا
''رعونتِ رنگ ونسل کے بُت کمال حیرت سے تک رہے ہیں''

کھڑے ہیں بُو ذر ، بلالِ حبشی ، علیؓ و عثمان ، ایک صف میں
''رعونتِ رنگ ونسل کے بت کمال حیرت سے تک رہے ہیں''

مرے نبی مشعلِ ہدایت ہیں گُم رَہی کی بسیط شب میں
ہیں سُرخ رُو جو مرے نبی کو ' رُخِ ہدایت سے تک رہے ہیں

مجھے تو جمشید یہ خوشی ہے کہ اس ادب سوز عہد میں بھی
نبی کے مدّاح ''روئے مِدحت'' جمالِ مِدحت سے تک رہے ہیں!

جمشید کمبوہ

نعت ﷺ

یہ حسنِ کائنات نبوت حضور کی
ہر دور کو رہے گی ضرورت حضور کی

ایمان کی ، یقین کی دولت ملے اسے
جس دل میں بس گئی ہو محبت حضور کی

علم و شعور ، فہم و فراست ، متاعِ خلق
تقسیم ہو رہی ہے وراثت حضور کی

ابن الولید سنتے ہی تھرا کے رہ گیا
کتنی ہے بے مثال تلاوت حضور کی

اسراء کی رات نور اجالے زمین پر
دیکھی ہے قدسیوں نے امانت حضور کی

پروردگار کا ہی یہ احسان ہے شفیق
جاری مری زباں پہ ہے مدحت حضور کی

شفیق بیگ چغتائی

چہرہ تمام رنگ تھا ، پیکر کرن تمام
کجلا کے رہ گئے مہ و پروین تن تمام

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نعتیہ قطعات

لازمی ہے کہ اُمّتی اُنؐ کے
رہیں اپنے رسولؐ کے تابع
جیسے مکّہ کے سب قبیلے رہے
اُنؐ کے حلف الفضول کے تابع

....

اُنؐ کی سیرت کی دینی خوشبو سونگھ
شہرِ طیبہؐ کی بھینی خوشبو سونگھ
اپنی سانسوں میں اس پسینےؐ کی
نور والی یقینی خوشبو سونگھ

....

بجھ نہیں پائے گا یہ آندھی سے
جانیے مت کہ ہے یہ دھیما چراغ
یہ کبھی سرد ہو نہ پائے گا
دلِ کہ حُبِّ رسولؐ کا ہے اُجاغ

....

آقاؐ کی محبت کے قرینے کی طرف آ
پیغام ملا ہے کہ مدینے کی طرف آ
جو اور کہیں پر بھی تجھے مل نہ سکے گی
اس تیرگی میں نور خزینے کی طرف آ

زیست کرنے کی ہے اِسی میں کلید
اُنؐ کی سیرت ہمیشہ دھیان میں رکھ
تیرگی سے نجات پانے کو
خود کو اِس نوری سائبان میں رکھ

....

حمد کے بعد صرف نعت ہی لکھ
اور اسے مقصدِ حیات ہی لکھ
اُنؐ کے اذکار نعت میں ہیں نسیم
نعت کو روحِ کائنات ہی لکھ

....

نسیمِ سحر

عقیدت

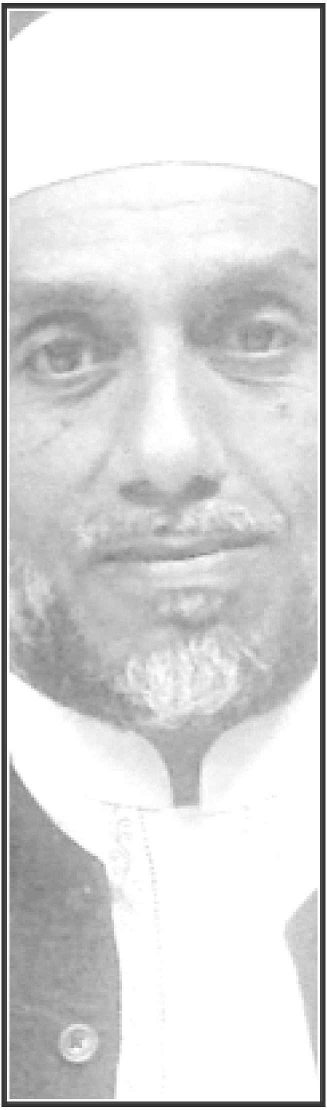

وہ نام لب پہ لاؤں مری کیا مجال ہے
نعتِ نبی سناؤں مری کیا مجال ہے

یادِ رسول بھی ہے مری سوچ سے ورا
جلووں کو دیکھ پاؤں مری کیا مجال ہے

جب تک بذاتِ خود نہ بلائیں مجھے حضور
اے دل! مدینے جاؤں مری کیا مجال ہے

پیشِ رضائے مصطفوی سر بہ خم رہوں
شکوہ زباں پہ لاؤں مری کیا مجال ہے

شوقِ ثنا بھی رب کی ہے نعمت بہت بڑی
پیشہ اِسے بناؤں مری کیا مجال ہے

مالک! مجھے نصیب ہو بس عجز نعت میں
ناز و ادا دکھاؤں مری کیا مجال ہے

"لاترفعوٓ" کا حکم ہے فیضانؔ سامنے
مدحت میں غُل مچاؤں مری کیا مجال ہے

فیض رسول فیضان

عقیدت

کیسے وجودِ جاں میں ہو عالی مقامِ دل
جب تک کرے نہ خود کو محمدؐ کے نام دل

پہلے وجودِ جاں کرے اُن کی وفا میں وقف
پھر بھیجے مصطفیٰؐ پہ درود و سلام دل

ہر نعت پر ہے پوچھتا مجھ سے مرا ضمیر
ناقص خیال و خامہ ہیں میرے کہ خام دل؟

ہیں آپؐ ہی معلمِ اخلاقِ زندگی
ہے جاں کو جیتنا تو کرو پہلے رام دل

سر کر کے خم امامِ اُمم کی جناب میں
ہو گا نہ پھر جہاں میں کسی کا غلام دل

اے رہ نوردِ شوق! یہ طیبہ کا ہے سفر
ہے چشمِ عشق میں یہاں اِک ایک گام دل

جب دھڑکنوں میں صلِّ علیٰ کا سرور ہو
طیبہ کے وجد و کیف سے ہے شاد کام دل

انساں امیں ہو عشقِ نبیؐ کا اِسی لیے
اِس مُشتِ گِل کو حق نے بنایا تمام دل

جنت کا مول جاں ہے تو پھر اس سے پیشتر
ہے بیچنا ہمیں یہاں طیبہ کے دام دل

ہے جب حریمِ فاتبعونی نگاہ میں
کیوں دیکھے پھر؟ کوئی در و دیوار و بام دل

ختم الرسلؐ کے دین سے اِس زیست کی طرح
قائم ہے ربطِ جاں تو ہے قصدِ قیامِ دل

اِس کو بھرے گا ساقیِ کوثر کا لُطف بس
ہے زندگی کے ہاتھ میں جیسا ہی جام دل

ذکرِ رسولؐ سا نہیں آصف! کسی کا ذکر
کسبِ کمالِ نور میں ہے صبح و شام دل

مرزا آصف رسول

عقیدت

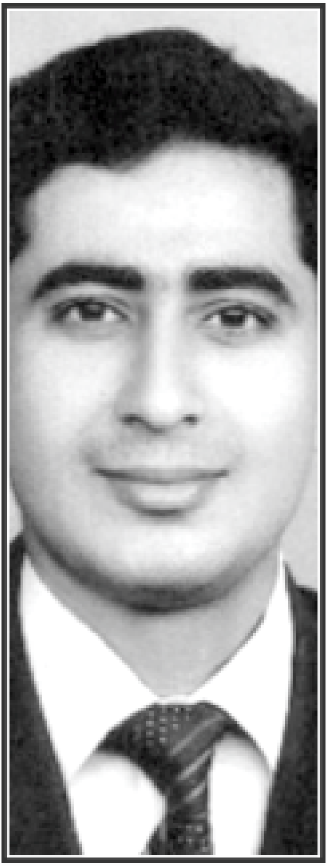

نبیل احمد نبیل

مجھ پر مرے حضورؐ کا اتنا کرم ہوا
ہر لمحہ اُس کی مدح پہ مائل قلم ہوا

فیضان ہے اسی کا مرا طرزِ شاعری
اُس نامِ پاک سے مرا قائم بھرم ہوا

قریہ بہ قریہ آپؐ کے اوصاف کا ہے ذکر
ہر سمت سر بلند نبیؐ کا علم ہوا

یہ بھی تو صرف حُبِّ پیمبرؐ کا فیض ہے
سوزِ دروں سے آنکھ کا آئینہ نم ہوا

مجھ سا حقیر اور درِ پاکؐ کا فقیر
رتبہ مرا کچھ اور بڑھا ، جتنا کم ہوا

یہ منصبِ بلند ملا ہے نبیل کو
وصافِ شاہِ عالم و میرِؐ اُمم ہوا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چہرے پہ سایہ گر عجب ابرِ جمیل ہے
باغِ جناں ہے پرتوِ رُخ سے بدن تمام

عقیدت

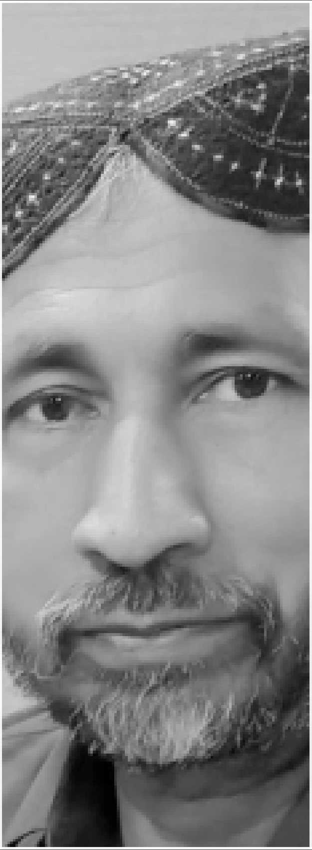

قلم اُٹھاؤ تو حمد و ثنا کی بات کرو
کہ رب کا ذکر کرو بس خدا کی بات کرو

فقط اُسی سے مخاطب ہو اور اُسی سے طلب
جو التجا بھی کرو یا دُعا کی بات کرو

جو تم کو منزلِ مقصود تک رسائی دے
تمام عمر اُسی رہ نما کی بات کرو

رضا میں اُس کی بہ ہر حال تم رہو راضی
بس اپنے رب سے ہمیشہ وفا کی بات کرو

نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ پہ ہو عمل
حیات میں اُسی طرزِ ادا کی بات کرو

ریاض ندیم نیازی

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

سلسلے بند کیے ، مہر لگا دی تو نے
صفحۂ ارض پہ اک آخری اُمت لکھی

رباعیات

جو اپنا تھا وہ اب ہے پرایا صد حیف
ہر ایک کو دشمن ہی بنایا صد حیف
تدبیر نہ چھوڑی کوئی ، پھر بھی ہم نے
اس عشق میں نقصان اٹھایا صد حیف

....

جس جس نے مری خاص طرف داری کی
سب زورِ بیاں تھا ، وہ سخن کاری کی
میں جن کو سمجھتا تھا ہمیشہ اپنا
تھے صرف اداکار ، اداکاری کی

....

ماہر سبھی احباب سخن کاری کے
پڑھتے ہیں کئی باب سخن کاری کے
ہیں ہم بھی اسی دشت کے اشعر سیاح
معلوم ہیں آداب سخن کاری کے

....

آنکھوں کو ذرا کھول کہ کشکول بھرے
دو لفظ کوئی بول کہ کشکول بھرے
آ بیٹھ مرے پاس یہی بہتر ہے
لے ہاتھ میں کشکول کہ کشکول بھرے

ہم لوگ ہیں رستے میں ، خدا مالک ہے
خرچہ نہیں بلتے میں ، خدا مالک ہے
ہے فیض سواری ہے ہماری خاطر
مل جائے جو سستے میں خدا مالک ہے

....

یہ رات بچاری ہے ہماری خاطر
تاریک سواری ہے ہماری خاطر
سیلاب میں بہتے ہوئے اک تختے پر
اب نیند ہماری ہے ہماری خاطر

....

بے رحم سے حالات ہیں صدقہ دے دو
ہر سمت ہی آفات ہیں صدقہ دے دو
کب تک یہ زمیں خود کو بچا سکتی ہے
حرکت میں سمٰوات ہیں صدقہ دے دو

سعید اشعر

رباعیات

تبدیل ہو فطرت کا نوشتہ کیسے
نفرت سے جڑے مہر کا رشتہ کیسے
ٹھہراؤ گے شیطان اگر اوروں کو
سمجھے گا تمہیں کوئی فرشتہ کیسے

کیا دن وہی دن رات وہی رات نہیں
تبدیل کوئی صورتِ حالات نہیں
اندازِ بیاں بات بدل دے ورنہ
دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

کچھ بھی ہو رقم نامہ سمجھ لیتے ہیں
جھگڑے کو بھی ہنگامہ سمجھ لیتے ہیں
اس شہر کے لوگوں کی بصیرت دیکھیں
فدوی کو بھی علامہ سمجھ لیتے ہیں

ذکر ان کا کیا ان کو سلامی کی ہے
دور اپنے خیالات کی خامی کی ہے
یہ فخر مرا سر نہیں جھکنے دیتا
میں نے شہِ مرداں کی غلامی کی ہے

مانا ہمیں صابر بھی کہا جاتا ہے
حد تک ہی مگر جبر سہا جاتا ہے
مرگِ سگِ دنیا جو شہادت ٹھہرے
خاموش کہاں ہم سے رہا جاتا ہے

لائے ہمیں کیوں گردشِ افلاک اوپر
ہم خاک نشیں آئیں گے کیا خاک اوپر
دنیا کے سمندر میں یہی دیکھا ہے
نیچے دُر و گوہر، خس و خاشاک اوپر

سرمائے کی دولت کی پجاری دنیا
احساس کی خصلت سے ہے عاری دنیا
جابر کے لیے خود کو جھکا دیتی ہے
مجبور پہ کرتی ہے سواری دنیا

در آئی رویوں میں جہالت کیسی
مجہول رویے کی وکالت کیسی
ہو فیصلہ حق میں تو کہو زندہ باد
برعکس پہ کہتے ہو عدالت کیسی

وابستہ اسی فیض کے در سے رکھنا
محفوظ ندامت کے خطر سے رکھنا
یا رب ہو ضروری بھی اگر حشر و حساب
پوشیدہ محمد کی نظر سے رکھنا

ماؤں کا بچھڑ کر بھی کرم رہتا ہے
فیض ان کی دعاؤں سے بہم رہتا ہے
برسات گزرنے پہ بھی جیسے اکثر
بارش نہ رہے خاک میں نم رہتا ہے

جب تک نہ کہیں عدل کی زنجیر لگے
کیسے کوئی انسان جہانگیر لگے
انصاف کی تحصیل ضروری ٹھہری
اچھا ہے نشانے پہ اگر تیر لگے

گلزار بخاری

رباعیات

اپنا پہلو بدل کے دیکھا میں نے
سائے سے پرے اچھل کے دیکھا میں نے
پیچھے تھا خیال بھر تماشا میرا
خود سے آگے نکل کے دیکھا میں نے

....

تصویر میں شمعِ آرزو رقص کرے
آوازِ رنگ چار سو رقص کرے
آسودۂ نقش دیدۂ راز کا خواب
کوئی دیکھے تو کوبکو رقص کرے

....

دریا میں ناچتا ہے مینا میرا
قطرے میں دم بھرتا ہے دریا میرا
میں آئنۂ حسن میں ہوں عکسِ نمود
ہوتا ہے حسینوں میں تماشا میرا

....

ہم رنگِ طرب غم آفریں ملتے ہیں
تن سے خالی بھی کچھ حسیں ملتے ہیں
تصویر کا ملبوس اتر جاتا ہے
رقص اور رقاصہ جب کہیں ملتے ہیں

....

سازینۂ موجِ آرزو تیز کرو
رفتارِ خرامِ آب جو تیز کرو
ہانکو سوئے فلکِ گماں کے ریوڑ
اے عشق گرو رقصِ سبو تیز کرو

....

شب پوش حسیں بال بکھیرے کھڑے ہیں
مصلوب ستاروں میں سویرے کھڑے ہیں
گھر کا رستہ بھول گیا ہے ہر چاند
سورج کے سائے میں اندھیرے کھڑے ہیں

....

عزت کو جگہ حسبِ گماں ملتی نہیں
مل جائے اگر جائے اماں ملتی نہیں
یاروں نے جھوٹ کی دکاں کھولی ہے
اس شہر میں اب سچ کو زباں ملتی نہیں

....

شہنائی میں آنسو رکھ دیئے ہیں میں نے
آواز میں جگنو رکھ دیئے ہیں میں نے
پہلو میں حسینۂ غزل ناچتی ہے
الفاظ میں گھنگھرو رکھ دیئے ہیں میں نے

محمد نصیر زندہ

شاہ گوری کے بھوت

شہباز خان کو ایک صبح سیاحت کے مرکزی محکمہ اسلام آباد سے فون کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ سائنس دانوں کی ایک جماعت جو تین افراد پر مشتمل ہے، کل دوپہر کی پرواز سے سکردو پہنچ رہی ہے۔ اُن کے رہنے سہنے کے علاوہ ان کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ برفانی چیتے کے بارے میں تحقیقات کر سکیں اور حکومت پاکستان کو ایک دستاویز بنا کر دیں کہ کس طرح اس غیر معمولی اور خوب صورت جان دار کو نیست و نابود ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

شہباز نے سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ سائنس دانوں کا گروہ خالی ہاتھ واپس چلا جائے اور اُس پُر اسرار اور خفیہ مخلوق کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ یہ افواہ گرم تھی کہ شکاریوں نے اُس کی خوب صورت اور ریشمی کھال کی وجہ سے چن چن کر برفانی چیتے ہلاک کر دیے ہیں۔ وہ کھال یورپی ممالک میں بہت مہنگے داموں بکتی ہے۔

شہباز پچھلے دس سالوں سے سیاحت کے پیشے سے وابستہ تھا۔ اس نے سیاحوں کو شاہ گوری اور نانگا پربت کے اونچے پہاڑوں کی سیر کرائی تھی لیکن اس کا کبھی برفانی چیتے سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اُس نے مار خوروں کے جھتے دیکھے تھے اور مشہور ہے کہ جہاں مار خور ہوں وہاں برفانی چیتا بھی ضرور موجود ہوتا ہے۔ مارخور کا گوشت اس کا من بھاتا کھاجا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ برفانی چیتا نام کی کوئی مخلوق نہیں۔ یہ بھوت میں جو برفانی چیتے کا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور جب کوئی ان کے قریب آتا تو بھوت بن کر غائب ہو جاتے ہیں۔

شہباز نے دوسرے دن ان سائنس دانوں کی رہائش کا انتظام کے ٹو ہوٹل میں کر دیا اور ان کو لینے کے لیے دو بجے کے قریب ہوائی اڈہ پر پہنچ گیا۔

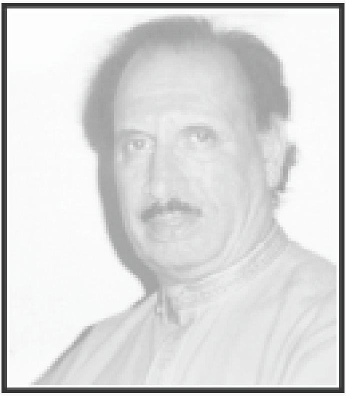

انور خواجہ

تھوڑی دیر بعد اونچے اونچے فلک بوس اور سفید کلغی والے پہاڑوں کے اندر سے ایک پرندہ طلوع ہوا اور چند لمحوں بعد وہ ایک ہوائی جہاز کی صورت میں بدل گیا اور چھوٹے سے ہوائی مستقر پر اتر گیا۔ جہاز کے اترنے کے منظر کو دیکھ کر وہ ہوابازوں کی مہارت پر حیران ہوتا کہ کس طرح وہ اونچے اونچے پہاڑوں کی دیوارں کے درمیان اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو بحفاظت اس چھوٹے سے میدان میں اتار لیتے ہیں۔

جہاز کا دروازہ کھلا، پندرہ سولہ آدمی اترے، اُن کے پیچھے تین گورے آدمی بھی باہر آئے جنھوں نے بڑے بڑے تھیلے اٹھا رکھے تھے۔ شہباز ان کی طرف لپکا۔

"میرا نام شہباز ہے اور میں آپ کا گائیڈ ہوں۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

ایک لمبے آدمی نے اس سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میرا نام ہنٹر ہے اور میں اس گروہ کا راہنما ہوں۔ یہ میرے ساتھ دو اور سائنس دان ہیں...... فورڈ اور ڈیوڈ۔"

شہباز نے باقی دو لوگوں سے بھی ہاتھ ملایا۔ جب اُن کا سامان آیا تو وہ جیپوں کے ذریعے وہ لوگ کے ٹو ہوٹل پہنچ گئے۔ شہباز نے اُن سے اجازت لی اور ہنٹر کو بتایا کہ ہوٹل کے منیجر کو فون کریں، وہ ہر چیز آپ کو مہیا کر دے گا، باورچی کو بلوا کر اپنی پسند کا کھانا بنوالیں۔ چونکہ یہ ہوٹل سیاحوں اور کوہ پیماؤں سے بھرا رہتا ہے اس لیے وہاں کے باورچی ہر طرز کا کھانا پکانے میں ماہر ہیں۔

ایک ہفتہ کے قیام کے دوران شہباز نے پہاڑوں پر سفر کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ چھ مزدور بھی بھرتی کر لیے تھے، ایک باورچی اور ایک کھوجی سلمان کی خدمات بھی حاصل کیں جو ایک سابق فوجی تھا۔ اس کے پاس بندوق تھی۔ پانچ جیپوں میں یہ قافلہ سوار ہو کر منہ اندھیرے روانہ ہوا۔ شام کو اسکولے پہنچا۔ یہاں عجیب سماں تھا۔ گاؤں کے باہر میدان میں ایک خیموں کا شہر آباد تھا۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ بیٹریوں کے توسط سے ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔ کھانے پک رہے تھے۔ موسیقی کی تانوں نے فضا کو مخمور کیا ہوا تھا۔ بہت سے ممالک سے آئے ہوئے لوگ شاہ گوری پر چڑھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ لوگ واپس بھی آئے تھے، گھوم پھر رہے تھے اور خیموں میں داخل ہو کر ایک دوسرے کا حال احوال بھی پوچھ رہے تھے۔ اسکولے آخری گاؤں اور آخری آبادی تھی، اس سے اوپر ننگے برفیلے پہاڑ عظیم الجثہ برفانی

تودے اور چٹانوں کا راج تھا۔ ایک خاموش اور لق و دق دنیا تھی۔

یہاں کے لوگ شکل و صورت میں باقی پاکستان کے لوگوں سے مختلف تھے۔ مردوں کے چہرے بیضوی اور رخساروں کی ہڈیاں اونچی تھیں۔ وہ شلوار قمیض کے اوپر گھریلو کھڈیوں پر بنے چوغے پہنے ہوئے تھے۔ عورتوں نے رنگین دھاگوں سے بنی ٹوپیاں پہنی تھیں۔ بال سیپوں اور منکوں میں گندھے ہوئے، مینڈیوں کی صورت ان کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی کالی کالی آنکھوں میں سرمے کی لکیر ہوتی تھی۔

وہاں کے لوگ اردو نہیں جانتے تھے۔ اپنی بولی میں باتیں کرتے تھے اور کچھ لوگ انگریزی کے الفاظ بھی سیکھ گئے تھے ان کو وہ پیاؤں اور سیاحوں سے جو اُن کے گھر بھی ٹھہر جاتے تھے۔

اسکولے میں دو دن قیام کرنے کے بعد جب ان سائنس دانوں کے بدن اس خشک اور ٹھنڈی ہوا کے عادی ہوئے تو آگے سفر شروع ہوا۔ اب یہ سفر پیدل تھا۔ سائنس دانوں کے گروپ سے مزدور آگے نکل جاتے اور کسی چٹان کے سہارے ستانے لگتے اور جب گروہ نزدیک آتا تو وہ پھر چل پڑتے۔ پانچوں کے قریب شام ہونے لگی اور اس کے سامنے ایک اونچی پہاڑ کی دیوار تھی اور دائیں طرف ایک میدان تھا جس میں درخت نہیں، پودے لگے تھے اور پانی کی چھوٹی چھوٹی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اس کے آگے گہری کھائیاں اور پیچھے دور پہاڑ تھے۔

کھوجی سلمان نے یہاں خیمے لگانے کی تجویز پیش کی۔ خیمے کھڑے ہو گئے اور سب نے فوراً چائے طلب کی۔ تھوڑی دیر کے بعد باورچی خانے سے گرم گرم چائے آئی اور پھر رات کے لیے پلاؤ گوشت پکنے لگا، سبزیاں اُبلنے لگیں۔

صبح سویرے کھوجی سلمان اور شہباز اوپر منڈیروں کی طرف بڑھے کہ چیتے کے پاؤں کے نشان تلاش کریں۔ ایک غار کے پاس سلمان کو چیتے کے پنجوں کے نشان گیلی مٹی میں نظر آئے۔ اس نے وہاں شکنجہ گاڑھ کر اس کے اوپر مٹی ڈال دی۔

اب وہ ہر صبح جا کر اس جگہ کا معائنہ کرتے لیکن شکنجہ اسی طرح لگا ہوا تھا اس کے پاس چیتے کے پاؤں کے کوئی تازہ نشان نہیں تھے۔

چار دن کے انتظار کے بعد جب کوئی چیتا اس شکنجے میں نہ پھنسا تو مہم کے سربراہ ہنٹر نے آگے چلنے کا حکم دیا۔ سلمان شکنجہ لے کر واپس آ رہا تھا تو اسے چٹان پر کھروں کے بجنے کی آواز آئی۔ جب وہ اپنے گروہ کے

پاس پہنچا تو آسمان سے ایک اُڑتی ہوئی شے نظر آئی۔ ایک بہت بڑا مارخور اپنے خوب صورت خم کھائے سینگوں کو ایک بازی گر کی طرح گھماتا ہوا اُن کے سامنے اترا۔ دوسرے لمحے اس نے پھر چھلانگ لگائی اور کھائی کے پار پہنچ گیا۔ لیکن وہ کھائی کافی گہری اور چوڑی تھی تو اندازہ نہیں ہوا کہ وہ پار اترا کہ نہیں۔ ایک غراہٹ سنائی دی جو گرج میں بدل گئی۔ سب نے اوپر دیکھا، ایک حسین وجمیل برفانی چیتا ایک چٹان پر کھڑا تھا اور خون خوار نظروں سے پیچھے کھڑے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سفید کھال اور ان پر کالے دھبے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اس کے جارحانہ رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مارخور ان لوگوں کی وجہ سے اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

سلمان کھوجی نے اپنی بندوق تان لی، اگر چیتا ان پر حملہ آور ہو تو وہ اسے ہوا میں گولی مار دے۔ چیتے نے گردن گھما کر سب کا جائزہ لیا لیکن اتنے لوگوں کا مقابلہ کرنے میں شاید وہ کامیاب نہ ہو، اس نے اپنا سر اونچا کیا اور ہوا میں کوئی چیز سونگھنے کی کوشش کی۔ شاید مارخور کے بدن کی خوشبو ابھی تک فضا میں پھیلی تھی۔ دوسرے لمحے ایک سفید بگولہ اڑا اور کھائی میں غائب ہو گیا۔ سارے لوگ چند لمحوں کے لیے دم بخود رہ گئے۔

”اب ہمیں چند دنوں کے لیے یہاں رکنا پڑے گا۔“ سلمان کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔

”ہمیں یقیناً یہاں رکنا پڑے گا۔“ ہنٹر نے سلمان کی تائید کی۔ ”یہاں مارخور موجود ہے اور چیتا بھی موجود ہے۔ اب مرحلہ چیتے کو پکڑنے کا ہے۔“

”میں کوشش کروں گا کہ اس چیتے کو پکڑلوں، چیتا کی ایک خصلت مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنا علاقہ آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ میں تین چار غاروں کے پاس شکنجے لگادوں گا۔“ سلمان کھوجی نے کہا۔

دو تین دن گزر گئے۔ سلمان کھوجی اور شہباز تینوں شکنجوں کا جائزہ لیتے رہے۔ یہ انتظار کے لمحات بڑی مشکل سے کٹ رہے تھے۔ سائنس دانوں نے اردگرد پہاڑوں کی تصاویر اتاریں اور ویڈیوز بنائیں۔ چوتھے دن جب سلمان اور شہباز بڑی غار کے پاس پہنچے تو شکنجہ میں ایک بہت بڑا چیتا پھنسا ہوا تھا۔ وہ ان کو دیکھ کر بری طرح غرایا اور غصے سے اچھلا۔ یوں لگا کہ وہ شکنجہ کی پروا نہ کرتے ہوئے ان پر حملہ کردے لیکن اس کا دایاں پنجہ اس طرح پھنسا تھا کہ جب وہ اچھلا تو اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ پلٹے

کھانے لگا۔ جب وہ رکا تو اس وقت باقی سائنس دان بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہنٹر نے فورڈ کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک خاص بندوق سے چیتے کی گردن کو نشانہ بنایا اور دوائی سے بھری ہوئی سوئی اس کی گردن میں اتار دی۔ چیتا غیض و غضب میں دھاڑا اور سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ پندرہ منٹ بعد چیتا بے حس و حرکت زمین پر پڑا تھا۔ سلمان نے کھینچ کر شکنجہ کی کمانی الگ کی۔ چیتے کا پنجہ زخمی ہو گیا تھا۔ فورڈ جانوروں کا ڈاکٹر تھا، اس نے ایک دوائی لگا کر اس پر پٹی باندھ دی۔

''ایک دو دن میں چیتے کا زخم اچھا ہو جائے گا اور وہ معمول کے مطابق اچھل کود کر سکے گا۔''

ہنٹر نے ایک چمڑے کا گلوبند اس کے گلے میں باندھ دیا۔ سب لوگ دور ہٹ کر بیٹھ گئے۔ بیس منٹ بعد چیتے نے سر اٹھایا، اِدھر اُدھر دیکھا، سر کو ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ پھر سارے بدن کو جھٹکا دیا۔ اپنے پٹی والے پنجے کو زبان سے چاٹا اور پھر اوپر کی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ دوائی کے اثر نے اس کی جارحانہ حس کو تھوڑے عرصہ کے لیے کم کر دیا تھا۔

''اگلے سال جب ہم واپس آئیں گے تو اس ریڈیو کالر کے ذریعے ہم اس چیتے کو تلاش کر لیں گے۔'' ہنٹر نے کہا۔

ان لوگوں نے دو دن انتظار کیا لیکن جب کوئی دوسرا چیتا شکنجے میں نہ پھنسا تو ہنٹر نے آگے چلنے کا ارادہ کیا۔

اب وہ ایک ایسی عجیب و غریب جگہ آ گئے کہ بادلوں نے انھیں گھیر لیا۔ ایسا لگا کہ وہ بادلوں کے اوپر چل رہے ہیں اور یہ کہ بلند سے بلند تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سلمان کھوجی سب سے آگے تھا اور پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اسے تجربہ سے معلوم تھا کہ ایسی صورت میں جب دو قدم آگے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا ہو تو وہ کسی گہری کھائی میں گر سکتے ہیں، جہاں سے نکلنا ناممکن ہوگا۔ پھر جانے کیا معجزہ ہوا جس طرح بادلوں نے انھیں ایک دشمن کی فوج کی طرح گھیرا تھا، چھٹ گئے۔ اب سامنے ایک برفانی چوٹی تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے میدان میں چل رہے تھے جس کے شمال میں غاریں ہی غاریں تھیں۔

ہنٹر، فورڈ اور کھوجی ان غاروں میں یکے بعد دیگرے جھانکنے لگے۔ لیکن کسی چیتے کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ جب میدان کے کنارے پر پہنچے تو ایک جھونپڑی نظر آئی۔ ایک ایسی ویران جگہ پر بھلا کون رہتا ہوگا۔ کوئی گڈریا ہو گا۔ کھوجی کی نظر جب

دوسری طرف پڑی تو بکریوں کا ایک ریوڑ سامنے آیا۔ کھوجی نے ہنٹر کو اس طرف اشارہ کیا۔ اب بکریوں کے پیچھے ایک گڈریا چلا آ رہا تھا جس نے سیاہ رنگ کے کپڑے پہنے تھے، پاؤں میں بڑے بڑے جوتے تھے اور ایک بھورے رنگ کا کمبل لپیٹا ہوا تھا، اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ اس گروہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کھوجی سے مخاطب ہوا۔

"آپ نے چیتے کی کھال خریدنی ہے، میرے پاس ایک زبردست کھال موجود ہے - ابھی تک پوری طرح صاف نہیں ہوئی۔ اسے میں نے نمک لگا کر لٹکایا ہوا ہے۔ بکریوں کو باندھ کر ابھی آپ کو کھال دکھاتا ہوں۔"

وہ بکریوں کو لے کر کوٹھڑی میں چلا گیا۔

"اس گڈریے نے چیتے کو کیسے مارا ہوگا؟" ہنٹر نے کھوجی سے سوال کیا۔

"اس نے گوشت میں زہر ملایا ہوگا، چیتا وہ گوشت کھانے کے بعد مر گیا اور اس گڈریے نے اس کی کھال اتار لی ہوگی۔"

"یہ تو بہت ظالمانہ طریقہ ہے۔" ہنٹر نے کہا۔

"ظلم تو ہے اور غیر قانونی بھی...... لیکن چیتا اس گڈریے کی کئی بکریاں شکار کر کے کھا گیا ہوگا، اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ چیتے کو ہلاک کرنا اور اس کی کھال فروخت کرنا اس کا حق ہے۔"

تھوڑی دیر بعد گڈریا آیا، اس کے ہاتھ میں ایک برفانی چیتے کی بڑی خوب صورت کھال تھی لیکن وہ اکڑی ہوئی تھی۔ یہ کھال اس نے پھیلا کر دکھائی۔

"جب نمک اس کھال میں سرایت کر جائے گا تو یہ ریشم کی طرح نرم ہو جائے گی۔ صاحب! آپ اس کا میم صاحب کے لیے ایک خوب صورت کوٹ بنا سکتے ہیں۔"

ہنٹر نے کھال کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"کتنے پیسے لوگے؟" کھوجی نے پوچھا۔

"دس ہزار روپیہ لوں گا، ایک پائی بھی کم نہیں۔"

گڈریا نے کھال کو لپیٹنا شروع کیا۔ غرانے کی آواز آئی۔ سب نے اوپر کی طرف دیکھا۔ ایک بہت بڑا برفانی چیتا چٹان پر کھڑا تھا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی۔ چیتے کی کھال کو گڈریا سے چھینا۔ وہ خوف کے مارے گر گیا۔ چیتے نے کھال کو جبڑے میں پکڑا اور کھائی میں کود گیا۔ سارا گروہ اسے حیران ہو کر دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆

''دل پتھر کا''

ماریہ کمرے میں آئی تو ایاز ٹی وی لگائے خبریں سن رہا تھا....سارے کمرے کی کھڑکیاں دائیں اور بائیں بند تھیں....تو ماریہ نے کھڑکیاں کھولیں اور کہا۔

اتنا اچھا موسم ہے....آسمان سے برتی بوندیں اور خنک ہوائیں چل رہی ہیں....ایسے موسم میں یاد ہے ہم لونگ ڈرائیو پر جاتے تھے....پھولوں سے بھرے درخت نظروں سے گزرتے کتنی تقویت دیتے تھے....یہی خوب صورتی تو مجھے اسلام آباد میں کھینچ کر لے آئی ہے.....تیز ہوا کا جھونکا یک دم اندر آیا اور ایاز چیخ پڑا.....بند کر دو سب کھڑکیاں...اور چلی جاؤ....ماریہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا تو ایاز نے غصے سے کہا۔

مظلومیت کا مظاہرہ مت کرو۔

''میں پوچھ سکتی ہوں مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟''

میں کہتا ہوں چلی جاؤ....اس نے پھر دہرایا اور ماریہ دلبرداشتہ ہو کر دوسرے کمرے میں آئی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو سچے موتیوں کی طرح گالوں پر پھسل رہے تھے....اور اپنی سہیلی کو فون پر کہا۔

ثمینہ جانتی ہو میرے دل میں اس کے لیے کوئی محبت یا نفرت نہیں....جذبات سے عاری ہو گیا ہے۔ آنسو ڈھلک کر گالوں پر مسلسل پھسل رہے تھے....ماریہ اپنی سہیلی سے محو گفتگو تھی....سیل فون اس کے کان میں لگا ہوا تھا....مگر دل کا خانہ خالی تھا....ثمینہ اسے سمجھا رہی تھی....شکر کرو تم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہو....شوہر کے دل میں محبت نہیں تو نفرت بھی نہیں ہو گی۔ بیماری کی حالت میں اس طرح غلط سلط الفاظ منہ سے نکل جاتے ہوں گے.....اور تم دل پر لگا لیتی ہو۔

کیا کروں....یہ پہلے جیسا نہیں رہا....بدل گیا ہے۔

اور تم۔

میں بھی بدلنے کی کوشش کرتی ہوں مگر۔

مگر کیا......؟

پھر اس کی حالت دیکھ کر رحم آ جاتا ہے۔

بلقیس ریاض

اس لیے کہ تم ابھی بھی اس سے محبت کرتی ہو۔
نہیں... محبت کا خانہ میرے دل میں خالی ہے۔ اسے پرواہ ہی نہیں کہ میں اس کی کتنی خدمت کرتی ہوں.... ہر وقت کہتا ہے کہ اگر تم نہ بھی ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔
ایاز بھائی کو.... یہ نہیں کہنا چاہیے.... اگر میں بات کروں تو شاید ان کے دل میں چھپی ہوئی محبت پھر جاگ جائے۔
"نہیں... محبت.... تو کہیں دفن ہو گئی ہے.... سیدھے منہ بات کرلے تو بڑی بات ہے"۔
"پھر ایک کام کرو"۔
"کیا"
"ایک ہفتہ کے لیے اپنی بہن کے پاس چلی جاؤ"۔
"اپنے بیٹوں کے پاس کیوں نہ جاؤں"۔
"پگلی.... بہوئیں آجکل کی ساسوں کو برداشت نہیں کرتیں۔ بس بہن کے گھر جاؤ...شاید تمھاری کمی محسوس کرے"۔
میری کمی قیامت تک محسوس نہیں کرسکتا.... اس کا دل پتھر کا بن گیا ہے۔ لڑکے کتنے ہوشیار نکلے ہیں.... بیویوں کے ساتھ علیحدہ گھروں میں رہتے ہیں.... کاش ایک بیٹی ہوتی جو میرا غم بانٹتی چھوڑو ان باتوں کو غم اس نے کیا بانٹنا تھا وہ بھی اپنی گھرداری میں مصروف ہوجاتی۔
ثمینہ بتاؤ میں کیا کروں.... میرا دل کرتا ہے کہ اس گھر سے بھاگ جاؤں۔
بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ زندگی اکیلے بسر نہیں ہوتی۔ ہرا بھرا تمھارا گھر ہے.... راج کرتی ہو.... باہر نکل کر خوار ہو جاؤ گی۔
خوار ہونا چاہتی ہوں.... گھر میں میرا دل ویران ہوتا ہے.... اس کا کیا حل ہے۔
حل ہے تو سہی میں اس سے زیادہ بات نہیں کرتی.... مگر اس کو یہ کمی بھی محسوس نہیں ہوتی کہ میں خاموش کیوں ہوں۔
چھوڑو... دل پہ نہ لگاؤ..... کبھی نہ کبھی تمھارا خیال ضرور آئے گا۔ اچھا تب تک نہ جانے کیا حالات رنگ لائیں۔
اچھا چھوڑو سب باتیں.... اور بتاؤ کہ سب سہیلیوں کا پلان ہے کہ وہ مری جائیں.... دو چار دن رہ کر خوب انجوائے کریں گی۔
لیکن میں اس کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔
"کیوں نہیں جاسکتی.... تمھاری نند بھی اسی شہر میں رہتی ہے۔ اسے بلوا لو... اور ہمارے ساتھ چلو.... بہن اپنے بھائی کا خوب خیال رکھے گی۔ تمھیں چینج کی ضرورت ہے۔ اچھا میں ایاز سے پوچھوں گی۔ اگر اجازت دے دے گا تو میں ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں.... مجھے بھی شاید تھوڑا سا سکون مل جائے......"۔
"واہ.... یہ ہوئی نہ بات"۔
فون بند ہوا.. تو ماریہ نے دیکھا.... ایاز باہر

لان میں بیٹھا اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا....شام کے دھندلکے پھیل رہے تھے....آسمان پر رنگوں کی بارش تھی....درختوں کی اوٹ میں شفق کے کئی رنگ نظر آ رہے تھے.....لحظہ بھر کر ماریہ اس منظر میں کھو گئی.....اور ماضی کا دریچہ کھل گیا....اسی جگہ پر ایاز بیٹھا ..اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر کہہ رہا تھا کہ ماریہ میرے دل میں دھڑکن کی جگہ تم بستی ہو....میں کتنا خوش نصیب تم جیسی رفیقِ حیات ملی.....میری تو زندگی ہی بدل گئی ہے.....راتوں کو ہمیشہ دیر سے آتا تھا مگر جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو....تب سے دل کرتا ہے کہ جلدی سے دفتر سے اٹھوں اور گھر چلوں مجھے معلوم ہے تم بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہو گی ہو- ماریہ....گھر پہنچتے ہی وہ خوشی سے سرشار اسے اپنے احصار میں لے لیتا.....پھر وہ آبشار کے قریب سنگ مرمر کے بینچ پر بیٹھ کر آسمان پر پھیلی شفق کو انجوائے کرتے.....پھر ماریہ کو کہتا....جلدی سے تیار ہو جاؤ باہر کھانا کھانے کے لیے چلتے ہیں-

آج بھی کھانا تمھاری چوائس کا ہوگا- پھر وہ سوچتے ہوئے....جلدی سے چینج کر کے وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاتی....جب ماریہ کے ساتھ جاتا تو خود ڈرائیو کرتا....زندگی بڑی ہی حسین اور رنگین تھی.....خدا نے ایک بیٹا دیا پھر دوسرا....اور ایاز نے کہا....بس یہی دونوں ہمارے وارث ہیں....میں چاہتا ہوں تم اسی طرح حسین و سمارٹ رہو......بچے بڑے ہوئے.....سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک انجینئر اور دوسرا سول سروس میں چلا گیا....دونوں کی دھوم دھام سے شادیاں کیں....اور شادی کے بعد دونوں ہی علیحدہ ہو گئے- ایاز اور ماریہ ایک دوسرے کے ساتھ ابھی بھی اتنی محبت کرتے تھے کہ وہ اکیلے ہی خوش باش رہتے ...گھومتے پھرتے سوشل لائزنگ کرتے.....اور ویکنڈ پر بچے آ جاتے تو ان کے ساتھ خوب انجوائے کرتے لیکن وقت ایک جیسا نہیں رہتا.....ایاز ایک روز دفتر جا رہا تھا کہ سڑک پر کتا یکدم سامنے آیا....تو ڈرائیور نے بریک لگائی- سامنے سے تیز رفتار گاڑی نے یک دم زور سے ہٹ لگائی....تو ایاز کی گاڑی کا دروازہ کھلا اور وہ دو رفٹ پاتھ پر جا گرا....ڈرائیور کو بھی کافی چوٹیں آئیں-

جب ماریہ کو اطلاع دی گئی تو اس کا دل قابو میں نہ رہا....ہسپتال میں.....لے گئے اور کمر پر شدید چوٹیں آئیں.....بہت علاج ہوئے....تو ایاز پھرتی سے چل پھر نہیں سکتا تھا.....چھڑی کے سہارے چلتا....تکلیف روز بروز بڑھتی جا رہی تھی....ریڑھ کی ہڈی میں گہری چوٹ لگی تھی....ڈاکٹروں کے کہنے پر آپریشن بھی ہوا مگر....مکمل آرام نہیں تھا....بڑی مشکل سے

دفتر جاتا اور گھر آن کر.... خراب صحت کی وجہ سے.... سب رشتہ داروں، دوست احباب سے لاتعلق ہو کر.... ماریہ سے بھی بات بات پر الجھتا.... وہ ماریہ تھی جس نے اس کی محبت ہی دیکھی تھی.... اس کے غصے سے ناآشنا تھی.....

پھر کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ماریہ کے ساتھ بدتمیزی نہ کرے.... وہ شروع میں درگزر کرتی رہی تھی مگر.... اب اس کا دل بھی محبت سے خالی ہو چکا تھا.... باغیانہ خیالات اسے بھی ستانے لگے.... اگر یہ اتنی ہارش (Harsh) ہے تو میں بھی پرواہ نہیں کروں گی۔ اس وقت مری جانے کے لیے وہ ایاز سے اجازت لینے لگی۔

دو سال ہو گئے ہیں آپ کو بیمار ہوئے.... میں کہیں بھی نہیں گئی.... تمام سہیلیاں مری جا رہی ہیں.... کیا میں بھی ان کے ساتھ چلی جاؤں۔

ایاز نے اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔

پوچھنے کی ضرورت نہیں اتنے سارے ملازمین اور اٹینڈنٹ ہیں.... مجھے تمھاری کمی محسوس نہیں ہو گی۔

تو میں کل چلی جاؤں۔

"ہاں" وہ زور سے چلایا۔

لیکن میں نے امبر آپ کی بہن کو بلوا لیا ہے۔

اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

"کیوں"

ملازم خیال رکھیں گے مگر ماریہ نے پھر بھی امبر کو غیر موجودگی میں اپنے گھر رہنے کے لیے کہا اور سہیلیوں کے ساتھ مری چلی گئی.... اس نے ان کے ساتھ خوب انجوائے کیا.... ریسٹورنٹ میں اچھے اچھے کھانے کھائے اور ایاز کا خیال بھی کبھی آ جاتا تھا.... نہ جانے وہ کس حال میں ہو گا.... انجانے میں اس کا جی چاہنے لگا واپس چلی جائے... کہیں اس کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔

سب سہیلیوں کا واپس جانے کو دل نہیں کر رہا تھا مگر جانا پڑا.... واپس ماریہ گھر آئی تو امبر نے کہا۔

بھابی.... آپ چلی تو گئیں.... مگر بھائی بری طرح آپ کو miss کرتے رہے ہیں۔

ماریہ نے اس کی جانب دیکھا.... اور جواب دیا۔

خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں.... وہ اب ویسے نہیں رہے ہیں۔

کیسی باتیں کر رہی ہیں.... دروازے پر کوئی آہٹ ہوتی تھی تو کہتے تھے دیکھو ماریہ آ گئی ہے.... سو دفعہ دن میں تمھارا نام لیتے تھے.... ہیں تو میرے بھائی.... میرے آنے کی بھی انہیں خوشی نہیں تھی۔

ماریہ نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا تو اس کا چہرہ بجھا بجھا سا دیکھا ...اور کہا۔
شکریہ تمھارا تم نے ان کا خیال رکھا...وہ بولی تو کچھ نہ اور اپنا سامان پیک کر کے ....منہ بسورے واپس جانے کے لیے باہر قدم رکھے اور بیزاری سے جاتے جاتے کہہ گئی میری ضرورت ہی نہیں تھی ان کو۔ شام کے وقت وہ دفتر سے لوٹا۔
تو ماریہ کو دیکھ کر خوشی اور حیرت کے جذبات اس کے چہرے پر عیاں ہو گئے....وفور جذبات سے آگے بڑھا اور ماریہ کو حصار میں لے لیا...کیوں چلی گئی تھی....میں بہت اُداس ہو گیا تھا...ماریہ نے حیرت سے اسے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔
"آپ اور اداس"
ہاں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا...تم سے ہی میں آباد ہوں....مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی قیمتی شئے کھو دی ہو....خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جانا.....میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔
ماریہ نے اس کی جانب دیکھا...دو سال سے جو محبت کہیں کھوئی ہوئی تھی۔ آن کی آن میں نہ جانے کہاں سے اڑتی ہوئی اس کے دل میں داخل ہو گئی اور جو دل پتھر کا بن گیا تھا وہ موم کی طرح پگھل گیا...تو دھیرے سے ماریہ نے کہا۔
نہ جانے میں نے کیوں سوچ لیا تھا کہ میرے دل میں محبت کا خانہ خالی ہو گیا ہے...مگر ایاز وہاں جا کر معلوم ہوا کہ میں اب بھی تم سے ویسی ہی محبت کرتی ہوں۔ میں نے ایسے ہی سوچ لیا تھا کہ آپ کا دل پتھر ہو گیا ہے....مجھے کیا معلوم تھا کہ ابھی بھی آپ کا دل گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نرم ہے۔ ظاہر ہے خوب صورت پھول کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہی ہیں...چبھن بھی ہوتی ہے، مگر اس چبھن میں ایک محبت چھپی ہوتی ہے..........اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی غروب آفتاب کا وقت ناقابل بیان اور دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سورج غروب ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی....باہر موسم بڑا ہی خوشگوار تھا۔ دور آسمان سیاہ بادلوں میں ڈھکا ہوا تھا۔
اور ہولے سے بولی۔
مجھے کچھ نہیں چاہیے تھا بس پہلے والی محبت....چاہیے تھی لیکن تم نے اتنی نفرت کی....کہ میں ---؟
اس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا...میرے دل میں اب بھی ویسی محبت ہے...کھڑکی سے تیز ہواؤں کا خنک جھونکا آیا تو اس میں بھی محبت کی گونج شامل تھی....ماریہ آگے بڑھی اور اس کے کندھے سے لگ گئی۔

☆☆☆☆☆

استقامت

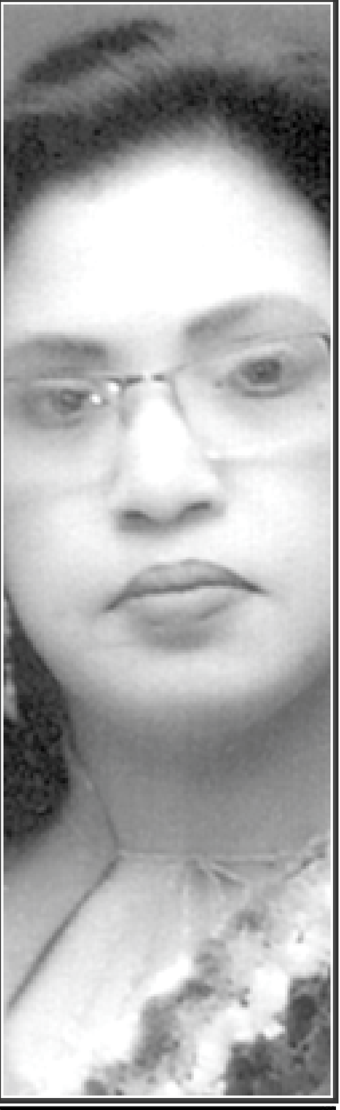

آسناتھ کنول

جنوری اپنے جوبن پر تھا۔ باہر کہرے کی چادر نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سردی کی شدت اس کی بوڑھی ہوتی ہوئی ہڈیوں میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ وہ کافی گرم کپڑے پہنے اور گرم چادر کو اردگرد کس کر لپیٹے ہوئے آتش دان کے سامنے کشن پر براجمان سردی کی اس شدت کو جھٹلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے داہنے ہاتھ سے اپنی خشخشی داڑھی کو کھجایا۔ کافی دنوں کی کسلمندی اور شدید سردی کے اس منظر نے اُسے اس کام سے باز رکھا تھا۔ آنکھوں میں تفکر اس کی نیند حرام کرتا رہا۔ چوڑے ماتھے پر گہری ہوتی ہوئی لکیروں میں اک فکر کی لکیر نمایاں ہوئی۔ آنکھیں سائے کے تعاقب میں چہرے کو تلاش کرتی ہوئی دیواروں سے پھسل کر آتش دان پر آ رکتیں۔ ایک نامعلوم سی اُداسی سارے کمرے میں چکراتی پھرتی تھی۔ اِک آہ اُس کے لبوں سے برآمد ہوئی۔ اگر یہ شدید ٹھنڈ نہ ہوتی تو یہ سورج اتنی بے اعتنائی نہ دکھاتا۔ وہ گھر کے خوب صورت گارڈن میں لگی بینچ پر بیٹھا، اخبار پڑھتا، کافی پیتا اور دھوپ کی نرم کرنوں سے لطف اندوز ہوتا، اُس نے سوچا کتنا پُر لطف ہوتا سب کچھ۔ اُس نے خود کو دھوپ سے (وٹامن ڈی) کشید کرتے

پایا۔ یکدم ہی اک مایوسی کی لہر نے اُس کے تصورات کو مسخ کر دیا۔ کچھ دیر پہلے اُس نے کھڑکی سے جھانکا تھا۔ ہر طرف دُھند نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ تا حدِ نظر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

آج اتنی سردی ہے۔ خانساماں۔ اپنے قریبی گاؤں سے کیسے آ پائے گا؟ وہ آتا تو کچھ کھانے کو ملتا۔ وہ تو صرف بمشکل آتش دان ہی روشن کر سکا تھا۔ اُس نے اِس سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے کچھ خشک پھل اور میوے قریب رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ختم ہونے والے تھے۔ چائے کافی کبھی اُس نے بنائی نہیں تھی۔ اُسے کبھی اِس تجربے سے گذرنا نہیں پڑا تھا۔ سب کچھ بنا بنایا سامنے حاضر ہو جاتا تھا۔ جب تک بیوی زندہ رہی، اُسے کوئی فکر نہیں رہی تھی۔ بیوی نے گھر بار پوری دانشمندی سے سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ہر گھریلو فکر سے آزاد صرف اپنی نوکری میں مگن رہتا۔ بیوی کی جدائی اور مستقل تنہائی نے اُسے اُجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اِس اذیت سے دو چار خود ترسی میں مبتلا ہو چکا تھا۔

کاش تم کچھ عرصہ اور رُک جاتیں تو میری زندگی کچھ اور سہل ہو جاتی۔ کتنی دیر وہ اپنی (مرحومہ) بیوی کو یاد کرتا رہا۔ دل کے گداز کے باعث آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ ایک نامعلوم وحشت گھیرنے لگی۔ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ کیسے ایک بھرا پُرا گھر خالی ہو گیا۔ بچے جوان ہو کر اپنے اپنے گھونسلوں میں جا بیٹھے۔ اور یہ گھر جو اُس نے بڑی محبت اور خوشی سے بیوی کے ساتھ مل کر بنایا تھا، خالی اور اُجاڑ پڑا اپنے چہکتے ہنستے مکینوں کو ترستا تھا۔

آصف رضا خان کا یہاں کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ کبھی کبھار ہمسائی مسز جمشید آ ٹپکتی۔ آصف رضا کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے وہ کتنی بار اُسے شادی کا کہہ چکی تھی۔ اپنی بیوہ بہن کے ساتھ جو کراچی میں ایک سکول چلاتی تھی، اور رضا خان اُتنی ہی مرتبہ انکار کر چکے تھے۔ اب گھر کی دیکھ بھال، صفائی، کھانا پکانا سب خانساماں کے ذمہ تھا۔ ایک عدد چوکیدار تھا، جو بہت کم اندر آتا۔ وہ صرف خانساماں ہی سے کام رکھتا اور خانساماں بلاشرکت غیرے ہر کام پر معمور تھا۔ بل کہ مالک تھا۔ آصف رضا خان پچھلے دو دن سے اپنی سوچوں میں گرفتار تھا اور خانساماں ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

اُسے شدت سے بھوک ستانے لگی تھی۔ کب تک ٹھنڈا پانی پی کر گزارا کرتا۔ خانساماں آتا تو کچھ پکا کر دیتا۔ کوئی تازہ سوپ، یخنی، کوئی شاندار ڈش۔ وہ سوچنے لگا۔ زندگی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ کہاں وہ کروفر والا آفیسر۔ کہاں اُس کے آگے پیچھے ملازموں کی قطاریں اور کہاں یہ بوڑھا ہوتا وجود جو ناتوانی کی طرف گامزن تھا۔ نہایت سلیقہ شعار اور ہنرمند بیوی نے سب کچھ بھلا رکھا تھا اور ریٹائرڈ لائف نے اُسے زندگی کی دوڑ سے باہر کرنے کی سعی کر رکھی تھی اور اب کی بار سردی

کی اس شدت نے اُس کے قویٰ مضمحل کر دیے تھے آج تیسرا دن تھا۔ اُس نے بازوؤں کا پورا زور لگا کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر وجود کشن پر ہی رکھا رہ گیا۔ بھوک کی شدت نے نقاہت بڑھا دی تھی۔ وہ کچھ دیر ہانپتا رہا۔ میں کبھی اتنا کمزور تو نہیں تھا۔ خانساماں کی غیر حاضری نے تو جیسے زندگی کرنے کا شوق ہی ختم کر ڈالا تھا۔ کیا آج تک میں صرف دوسروں کے آسرے ہی جیتا رہا ہوں۔

اُس نے سوچا مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ باہر چاہے برف ہی کیوں نہ گر رہی ہو۔ مجھے اپنے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ محتاجی کب تک! میرے پاس پیسے ہیں تو میں محتاج کیوں؟ اُس نے خود سے سوال کیا اور پھر ہمت دکھائی۔ محض بھوک کی وجہ سے جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اگر یہیں پڑا رہا تو یقیناً مر جاؤں گا۔ اور یہیں مر جانا کم ہمتی کی دلیل ہے۔ اُس نے بارِ دیگر ہمت جمع کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے پانی پیا۔ ٹانگوں میں کچھ جان آئی تو کچن کی جانب چل دیا۔ کھڑکی سے جھانکا تو کُہرا بدستور جما کھڑا تھا۔ فریج کھولی تو حیران رہ گیا۔ اُس میں کھانے پینے کی کافی چیزیں موجود تھیں۔ کیسی حماقت ہے۔ خانساماں کے انتظار میں پچھلے دو تین دن سے اُس نے کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی عقل کو کوسنے لگا۔ اُس نے کچھ پکی ہوئی سبزیاں اور بریڈ نکالی۔ جوس نکالا۔ چیزوں کو اوون میں گرم کیا اور کچن میں کھڑے کھڑے ہی کھانے لگا۔ جیسے ہی جسم میں خوراک گئی تو توانائی بحال ہونے لگی۔ پھر آنے بند ہوئے۔ تو چائے کافی بنانے کا طریقہ نیٹ پر دیکھ کر کافی کا ایک بڑا مگ تیار کیا۔ اور آتش دان کے سامنے بیٹھ کر پینے لگا۔ یوں جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ پی رہا ہو۔ کم از کم اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی تو وہ پہلی مرتبہ ہی پی رہا تھا۔ جیسے امرت رس پی رہا تھا۔ بھوک کتنی بڑی حقیقت ہے۔ اُس نے سوچا سردی کی شدت میں بھی کمی محسوس ہوئی۔ موسم اتنا بھی ٹھنڈا نہیں جتنا میں نے خود پر سوار کر رکھا ہے۔ شاید بھوک اور کمزوری کی وجہ سے لگتا ہو گا۔ اس کے اردگرد کتنی دُنیا بھوکی سوتی ہوگی۔ اُس نے افسری کے زعم میں سوچا ہی نہیں تھا۔ مگر پچھلے دو تین دنوں نے اُسے زندگی کا یہ سبق عملی طور پر یاد کروا دیا تھا۔ میں کتنے لوگوں کی مدد کر سکتا تھا۔ مگر نہیں کی۔ یہ کتنی قابلِ افسوس بات ہے۔ کافی پینے کے بعد اُس نے باہر جھانکا۔ کچھ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کُہرا کافی حد تک کم ہو چکا تھا بار بار فون کرنے کے باوجود خانساماں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

چلو ذرا مارکیٹ تک جاتا ہوں۔ کچھ کھانے کو لے آؤں۔ اور ذرا گھوموں پھروں۔ زندگی کو محسوس کروں۔ اب وہ نئے سرے سے کچھ سوچ رہا تھا۔ خانساماں کو کیا ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ اتنا غیر ذمہ دار تو نہیں تھا۔ ضرور کوئی مسئلہ ہوگا۔ چلو فون کرتا ہوں۔ کوئی تو اُٹھائے گا وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ میرا خیال ہے مارکیٹ تک جانا چاہیے تاکہ شام کے کھانے کے لیے کچھ تازہ لے آؤں۔ ذرا سستی بھی دُور ہوگی۔ وہ گھر سے باہر نکلا۔ چوکیدار دروازے پر موجود تھا۔

تم بہت بیوقوف آدمی ہو۔ دل چاہتا ہے کھڑے کھڑے تمھیں نوکری سے نکال دوں۔ کتنے بے حس ہو۔ رضا خان اُسے ڈانٹنے لگا۔ وہ ہونقوں کی طرح اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے خانساماں غائب ہے۔ جانتے ہو ناں۔ جی صاحب! میں بھی آج ہی آیا ہوں۔ میری والدہ بیمار تھیں اور میں خانساماں کو بتا کر گیا تھا۔ تو آج تم نے خانساماں کو بتایا کہ تم آ گئے ہو۔ مجھ سے پوچھنا اور بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ کیا خانساماں تمھیں تنخواہ دیتا ہے۔ رضا صاحب کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ غلطی ہو گئی صاحب، معاف کر دیں۔ بچوں والا ہوں۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔ رضا صاحب خاموش ہو گئے۔۔ اپنی کمزوری کو ایک گارڈ پر ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔ خیال رکھنا۔ کوئی ملنے آئے تو بتا دینا۔ جی صاحب۔ وہ شرمندہ سا نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اس بات پر تو وہ بھی حیران تھا کہ خانساماں احمد علی اب کیا نہیں آئے گا۔ وہ کافی دیر سوچتا رہا۔

آصف رضا خان مارکیٹ پہنچے۔ ماحول کافی خوشگوار لگا۔ یا شاید پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا۔ دونوں ہاتھ کوٹ میں دبائے وہ ایک پیزا ہٹ کے سامنے پہنچے۔ چلو ایک پیزا پیک کروا لیتا ہوں۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی کوئی شاپنگ کی ہی نہیں تھی۔ اچھا لگا میں خود کو کتنا بے بس سمجھ رہا تھا۔ کاش! میں نے پہلے ہی ان معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی۔ وہ دُکان پر پہنچا۔ ایک برقعہ پوش عورت ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ اُلجھ رہی تھی۔ اُس کی بے بسی اُس کی باتوں سے عیاں تھی۔ وہ بچے کو یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ پیزا اُس کی قوت خرید سے باہر ہے۔ مگر بچہ ماں کی مجبوری نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ ضد کرتا گیا کہ مجھے یہ چاہیے۔ رضا خان کچھ دیر یہ صورت حال سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ تو پتہ چل گیا تھا۔ کہ بچہ پیزا مانگ رہا تھا۔ اور ماں یہاں تک تو آ گئی ہے مگر پیزا خریدنے کی ہمت اُس میں نہیں ہے۔ وہ پیزا ہٹ کے اندر گئے، دو لارج پیزا آرڈر کیے۔ کچھ دیر بعد باہر نکلے تو خاتون بچے کو گھسیٹتے ہوئے واپس جا رہی تھی۔

بچہ پلٹ پلٹ کر دُکان کو دیکھتا اور اپنا مطالبہ دہراتا رہا۔ سنیے۔ رضا خان نے ہمت کر کے خاتون کو آواز دی۔ وہ یکدم رُکی۔ جیسے کسی اُمید پر قدم رُک گئے ہوں۔ رضا خان اُس کے قریب پہنچے۔ یہ لیجیے۔ نہیں نہیں یہ تو ایسے ہی ضد کیے جاتا ہے۔ میں اسے کل لے دوں گی۔ عورت کی آواز میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔ وہ بے چینی سے ہاتھوں کو مسل رہی تھی۔ یہ میں نے بچے کے لیے ہی لیا ہے۔ گھبرائیں نہیں۔ رضا خان نے مسکرانے کی کوشش کی۔ پہلی مرتبہ اس عوامی عمل سے اُسے بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ ذرا سی نیکی بھی کتنا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ اُس نے محسوس کیا۔ شکریہ صاحب۔ آپ نیک انسان معلوم پڑتے ہیں۔ بچے نے جلدی سے ڈبہ تھام لیا۔ ایک اور بات اگر آپ کو کبھی کوئی ضرورت ہو تو یہ قریب ہی گرے کلر کا گیٹ ہے۔ آصف رضا خان میرا نام ہے۔

آپ بے فکر ہو کر آسکتے ہیں۔ آئیے آپ کو گیٹ دکھا دوں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر کی جانب چل پڑا۔ بچہ بھی ماں کا ہاتھ پکڑے خوشی خوشی چل رہا تھا۔

عورت کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ گھر قریب ہی تھا۔ وہ گیٹ پر پہنچے۔ ایک بات اور۔ اگر آپ کو کام کی ضرورت ہو، کھانا وغیرہ پکانا جانتی ہوں تو مجھے بھی گھر کے لیے ایک میڈ کی ضرورت ہے۔ آپ کو ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔ رضا خان نے کچھ پیسے نکال کر بچے کو دیے۔ بیٹا یہ رکھ لو۔ کچھ لے لینا۔ عورت کچھ دیر سوچتی رہی۔ شکریہ صاحب۔ میں کل آپ کو جواب دوں گی۔ جی بہتر۔ عورت بچے کا ہاتھ تھامے چلی گئی۔ کافی ضرورت مند لگتی تھی۔ شیر خان۔ جی صاحب۔ یہ خاتون اگر آئے تو اس کا نام پتہ پوچھ کر مجھے بتا دینا۔ اس کے گھر بار کا پتہ کر لینا۔ کھانا پکانے اور گھر کے کاموں کے لیے رکھ لیں گے۔ جی صاحب، بہت بہتر۔

دامن کوہ سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں نے سارے اسلام آباد کو سردی کی شال میں لپیٹ لیا تھا۔ رضا خان پیزا لیے آتش دان کے سامنے آبراجے۔ وہ پچھلے دو دن کے واقعات کو یاد کر رہے تھے۔ جب کسی کو خبر ہی نہ تھی کہ رضا خان زندہ ہے یا مردہ۔ اللہ کا شکر ہے۔ میں نے بروقت کوشش کر لی۔ وہ خود کو کافی توانا اور خوش محسوس کر رہا تھا۔

سامنے دیوار گیر ٹی وی کو آن کیا اور حالات حاضرہ سے آگاہی حاصل کرنے لگے۔

صاحب اندر آجاؤں۔ ہاں آجاؤ۔ چوکیدار شیر خان اندر آیا۔ صاحب وہ لڑکی آئی ہے۔ جس سے آپ نے نوکری کی بات کی تھی۔ چلو اچھا ہے۔ بھیجو اسے۔ رضا خان گلشن سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ حجاب میں ملبوس خاتون بچے کا ہاتھ تھامے اندر آئی۔ سلام صاحب۔

تو تم نے کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جی صاحب! وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ تمھارا نام؟ ناصرہ امجد۔ کہاں رہتی ہو؟ صاحب وہ مشرقی کنارے کی کچی بستی میں کرائے کا ایک کمرہ ہے۔ سلائی کا کام کرتی ہوں۔ اپنے اور بچے کے لیے ایک وقت کی روٹی مہیا ہو جاتی ہے۔ شوہر ناحق ہی قتل ہو گیا تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں۔ بس ایک بیٹا ہی سہارا ہے۔ اچھا۔ گڈ۔ رضا خان نے ہنکارہ بھرا۔ تو ٹھیک ہے۔ آپ آج ہی کام پر آجاؤ۔ دراصل پچھلے دو سال سے میرے خانساماں نے ہی سارا کام سنبھالا ہوا تھا۔ کافی دنوں سے وہ آ نہیں رہا۔ اس کا فون بھی بند ہے۔ میرے لیے یہ مسئلہ بن گیا ہے۔ صاحب اس کے آنے کے بعد! خاتون نے تشویش سے پوچھا۔ نہیں نہیں کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کو کام پر رکھ لیا ہے۔ بے فکر رہو۔ ہاں بس ایک چیز کا خیال رکھیے۔ نئی ملازمہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ بدستور حجاب میں تھی۔ بس ذرا صفائی ستھرائی کا خیال رکھیے

گا- آپ بے فکر ہو جائیں- اب کہ وہ ذرا ریلیکس ہوئی- وہ واپس مڑنے لگی تھی- ہاں زکو- وہ انہی قدموں پر واپس پلٹی- یہ کچھ پیسے رکھو- اپنے اور اپنے بچے کے لیے کچھ کپڑے اور ضرورت کی چیزیں لے لینا- اندر باہر آنے جانے کا مسئلہ ہو تو شیر خان ہے اسے کہہ دینا- شکریہ صاحب- شیر خان- اندر آؤ-

جی صاحب- اس خاتون کو ساری جگہ دکھا دو- کام سمجھا دو- سرونٹ کوارٹر بھی دکھاؤ- اور کوئی کام ہے تو وہ بھی کرنا ہے- چونکہ وہ بچے والی عورت ہے- بار بار اندر باہر آنا جانا مشکل ہو گا اس کے لیے- جی صاحب ٹھیک ہو گیا- ہاں اسے کچن میں دیکھے جو چیز کم ہو، اسے لا دینا- یہ پیسے رکھو- مجھے وقت پہ سب کام چاہیے- سر بے فکر ہو جائیں- اس نے پیسے لیے اور باہر نکل گیا-

سردی کی شدت میں کمی آ گئی تھی- پھر بھی آصف رضا خان آتش دان کے آگے بیٹھے ایک کتاب کے مطالعے میں مگن تھے- وہیں لیٹے لیٹے صوفے سے ٹیک لگائے ہی سو گئے- اچانک آنکھ کھلی تو کھڑکی سے جھانکتی شام نے مسکرا کر دیکھا- وہ ابھی وقت کا اندازہ لگا رہے تھے کہ ایک جوان توانا آواز نے پکارا- صاحب کافی لائی ہوں- آپ پینا پسند کریں گے- وہ کچھ دیر آواز کے زیر و بم میں کھوئے رہے- وہ چار گھنٹے پہلے کے واقعات کو یاد کرنے لگے- یہ عورت کی آواز کہاں سے آئی- پھر انھیں یاد آیا کہ آج ہی اسے ملازم رکھا ہے- وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے- میں غالباً سو گیا تھا- وہ بڑبڑائے- جی سر- میں کچھ دیر پہلے دیکھنے آئی تھی- آپ سو رہے تھے- اوہو- کوئی کام تھا تو جگا لیتے- نہیں سر، آپ سے چائے کافی کا ہی پوچھنا تھا- شام ذرا خنک ہو جاتی ہے- ہاں ہاں- یہ تو ہے- تمھارے کمرے میں ہیٹر ہے- جی سر- شیر خان بھائی نے جلا دیا تھا- چلو اچھا ہے- اپنے بچے کا خیال رکھنا- صاحب کھانا کس وقت کھائیں گے- رضا خان پچھلے دو دن کے واقعات میں گم تھے- جب دو دن تک بھوکا رہنے پر مرنے تک نوبت آ گئی تھی- نو بجے تک کھاتا ہوں- جی صاحب- اور ناشتہ کس وقت- تاکہ مجھے پتہ رہے- ہاں اچھی بات ہے- مجھے آوازیں دینا پسند نہیں- صبح آٹھ بجے اور دوپہر دو بجے- شام میں چائے یا کافی- بس یہی روٹین ہے- اب یہ گھر آپ کو ہی سنبھالنا ہے- سیکھ لیجیے سب کچھ- جی صاحب- اور یہ جی صاحب میرا نام نہیں- رضا خان مسکرائے- مجھے رضا صاحب کہہ سکتی ہو- لیں سر- پڑھی لکھی ہو- سر میٹرک تک پڑھا تھا- پھر غریب والدین پڑھا نہیں سکے- بس شادی کر دی- اچھا چلو خیر- خدا بہتر کرے گا-

وہ واپس پلٹ گئی- رضا خان نے دیکھا وہ اچھے قد کاٹ کی جوان عورت تھی مگر حجاب میں رہتی- وقت اپنی چال چلنے لگا تھا- ناصرہ کچھ ہی دنوں میں سب کچھ سیکھ گئی- سارا گھر بڑے سلیقے سے اس نے سنبھال لیا- رضا خان کی اتنی اچھی دیکھ

بحال کی کہ وہ پھر سے خود کو چست اور توانا محسوس کرنے لگے۔ جم خانہ کلب جاتے۔ گالف کھیلتے۔ دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے۔ ساری مایوسی ختم ہوگئی تھی۔

کیا بات ہے بڈی۔ نئے سرے سے جوان ہو رہے ہو۔ کوئی گیدڑ سنگھی ہاتھ لگی ہے۔ صفی الدین نے چھیڑا۔ دونوں بیچ فیلو رہ چکے تھے۔ نہیں یار ایسی بات نہیں۔ سُنا ہے کوئی میڈ رکھ لی ہے۔ غالباً اُس کی خدمت گزاریوں کا اثر ہے۔ ہاں ڈیئر۔ خانساماں بغیر بتائے چلا گیا۔ فون کوئی اُٹھاتا نہیں۔ اس کی تشویش اپنی جگہ ہے۔ اُس کے گھر کا بھی پتہ نہیں۔ اُس کے بغیر تو بے کاری ہو گیا۔ یہ خاتون ضرورت مند تھی۔ پھر اُسے کام پہ رکھ لیا۔ اچھی سلیقہ شعار اور سمجھدار خاتون ہے۔ ایک بچہ ہے اُس کا۔ اچھا اچھا۔ چلو یہ تو اچھا ہوگیا۔ ویسے بھی اتنے بڑے گھر کو ایک عورت کی ضرورت تھی۔ بھابی کے جانے کے بعد تو سارا گھر ہی اُداس ہو گیا تھا۔ ٹھیک کہتے ہو صفی۔ رضا خان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

آج کل شفیق انگلینڈ سے آیا ہوا ہے اور صفدر خان بھی ہوسکتا ہے کسی دن تمہاری طرف چکر لگائیں۔ ہاں ضرور کیوں نہیں رضا نے رضامندی ظاہر کی۔ کافی دنوں کے بادلوں کے سائے کے بعد آج پھر دھوپ نکلی تھی، دُور مارگلہ کی پہاڑیاں چمک رہی تھیں۔ خنک ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ رضا موبائل تھامے لان کی طرف چل دیئے۔

اچانک ہی بالکل اچانک ایک جھلک ہی تھی۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس، شربتی آنکھوں والی خوب صورت عورت۔ ان کے قدم وہیں جم گئے۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ یہ کون ہے۔ ہوسکتا ہے ناصرہ کی کوئی رشتہ دار یا دوست ہو۔ وہ متاثر ہوئے تھے۔ وہ ایسی باتوں پر زیادہ غور نہیں کرتے تھے۔ ننھا رضوان ان کے قریب کھیل رہا تھا۔ ادھر آؤ۔ رضا خان نے پیار سے بلایا۔ جی انکل۔ وہ سمجھدار اور تمیزدار بچوں کی طرح پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ آپ کا نام۔ رضوان احمد۔ اوہ! بہت خوب صورت نام ہے۔ سکول جاؤ گے۔ پڑھو گے۔ جی انکل۔ شاباش۔ رضا خان نے خوشی کا اظہار کیا۔ اور کیا کھیلنا پسند ہے۔ کرکٹ، اُس نے قدرے توتلی زبان میں بتایا تو رضا مُسکرانے لگے۔ مدتوں بعد وہ کسی بچے سے مخاطب تھے۔ اپنے بچے تو کب کے اس دلیس سے اُڑ چکے۔ اُن کا تو بچپن بھی اب یاد نہیں رہا۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اب تو ہفتوں، مہینوں بچوں سے بات نہیں ہو پاتی۔ وہ اتنے مصروف ہیں کہ بوڑھے، اکیلے اور کمزور باپ کے لیے ایک کال کر کے حال پوچھنے کا بھی وقت نہیں ہے اُن کے پاس۔ ناصرہ نے کچن سے چائے لے کر آتے ہوئے یہ منظر دیکھا تھا۔

اُس کا دل ہمدردی سے بھر گیا۔ رضا صاحب

کتنے دُکھی ہیں۔ اُس نے سوچا۔ وہ چائے لے کر آئی تھی۔ اُنھوں نے دیکھا وہی کالا لباس مگر اب چہرہ حجاب میں تھا۔ ناصرہ آپ کا بچہ بہت ذہین ہے۔ آپ اسے سکول میں داخل کروا دیں۔ وہ کچھ دیر خلا میں گھورتی رہی۔ آں ہاں۔ سوری۔ رضا خان بولے۔ میں شیر خان کی ڈیوٹی لگاتا ہوں۔ داخلہ ہو جائے گا۔ ناصرہ نے ممنون نگاہوں سے اُنھیں دیکھا۔ یہ صاحب ہیں کہ فرشتہ۔ کتنے اچھے ہیں۔ میں اپنی ساری زندگی ان کی خدمت کروں گی۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا۔

اچھا آج میرے کچھ دوست آ رہے ہیں۔ آپ دو تین ڈشیں زیادہ بنا لیجیے گا اور میٹھا بھی۔ کتنے لوگ ہوں گے اندازاً۔ چار پانچ۔ ٹھیک ہے۔ بے فکر رہیں۔ وہ چائے دے کر واپس پلٹ گئی۔ وہ کتنی ہی دیر خالی نظروں سے اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ بچہ ابھی تک پاس کھڑا تھا۔ اُنھوں نے پاکٹ سے کچھ ٹافیاں نکال کر بچے کو دیں۔ وہ خوش ہو گیا۔ رضا کو بھی جیسے روحانی سکون میسر آیا۔ ناصرہ کے دل میں رضا خان کے لیے ہمدردی بڑھ گئی۔ اُس نے صاحب کے بارے میں شیر خان سے کافی کچھ سُن رکھا تھا۔ مگر اب اُسے یقین آ رہا تھا کہ اُس نے جو کہا وہ سچ تھا۔

آج شام گھر میں کافی گہما گہمی تھی۔ رضا خان کے چار عدد پرانے دوست خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سب اپنے پرانے قصے کہانیوں میں مگن تھے۔ اچانک ہی ایک جوان سُریلی آواز کان میں پڑی۔ سر چائے لگ گئی ہے۔ سب کان کھڑے ہوئے۔ چونک کر آواز کی جانب دیکھا۔ مگر آواز والی وہاں نہیں تھی۔ بڑے چھپے رستم نکلے۔ اویس خان نے چھیڑا۔ اوہ نہیں یار۔ یہ میری نئی میڈ ہے۔ شادی کے بارے میں نہیں سوچا۔ بڑے بکھیڑے ہیں۔ چلو چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ چائے کے ساتھ بہت سے لوازمات دیکھ کر سب حیران ہوئے۔ رضا تمھارے گھر میں اس سے پہلے اتنی اچھی چائے نہیں پی۔ صفدر نے ٹھوکا دیا۔ اب مل گئی ہے ناں۔ چپ کر کے پیو۔ بڈے کھوسٹ سارے لڑکے بنے ہوئے ہیں۔ کیا کہا۔ لڑکے ہی ہیں۔ دل جوان ہونا چاہیے بس۔ صفی نے بات بڑھائی۔ یونہی گپ شپ میں سبھی صحن سے باہر آ گئے۔ گپ شپ میں اچانک ننھا رضوان کہیں سے برآمد ہوا۔ اُسے ہاتھ پہ چوٹ لگی ہوئی تھی۔ رضوان بیٹا اِدھر آؤ۔ یہ کیا ہوا۔ انگل کر گیا تھا۔ دکھاؤ مجھے۔ اُنہوں نے ہاتھ دیکھا۔ پانی سے صاف کیا۔ اچھا جاؤ۔ ماما سے کہو۔ کچن کی ایک الماری میں دوائی پڑی ہے۔ وہ آپ کو لگا کر دے۔ اور یہ بھی لو۔ اُنھوں نے دو تین ٹافیاں نکال کر اُسے تھما دیں۔ بڑا بہادر بچہ ہے۔ رویا نہیں۔

یہ اس میڈ کا بچہ ہے۔ بہت اچھا بچہ

ہے۔ سبھی دیکھ رہے تھے کہ رضا خان کتنا خوش ہے ان لوگوں کی وجہ سے۔ باتوں باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ سر کھانا لگ گیا ہے۔ آجائیے۔ پھر وہی سُریلی آواز سُنائی دی۔ یار اپنی میڈ سے تو ملوادو۔ تم نے تو اُسے خفیہ رکھا ہوا ہے۔ یار وہ عام عورتوں جیسی نہیں ہے۔ پردہ دار عورت ہے۔ میرا گھر اُس نے اچھے سے سنبھال رکھا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔ ویسے ہم سب اب تجسس میں مبتلا ہیں۔ ایک میڈ کے لیے تم اتنے پُرتجسس ہو۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سویٹ ڈش کا ٹرے رکھنے آئی۔ تو سب اُسے دیکھنے لگے۔ وہ حجاب میں تھی۔ اُس نے کچھ برتن اُٹھائے اور نئے برتن سامنے رکھے۔ وہ تیزی سے واپس مُڑ گئی۔ صفدر سے رہا نہ گیا۔ رضا تمھارے سامنے بھی پردے میں رہتی ہے۔ ویسے کسی میڈ کو میں نے آج تک پردے میں تو نہیں دیکھا۔ شُو اس کی زندگی مزید سنور سکتی ہے۔ اگر یہ پردہ اُتار دے۔ اُس نے دائیں آنکھ دبا کر صفی کو دیکھا۔

رضا خان کو اس کی اس حرکت پر غصہ آگیا۔ صفدر تمھیں شرم آنی چاہیے۔ ہر عورت کے بارے ٹُچر خیالات ہر جگہ نہیں چلتے۔ کیا سمجھتے ہو۔ ہر عورت راہ چلتے آوارہ اور بدچلن ہوتی ہے۔ یا تم جیسے مرد اُسے ایسا بناتے ہو۔ صفی نے لقمہ دیا۔ جذباتی پن نہیں یار۔ اتنی عمریں گذار لینے کے بعد بھی کیا ہمیں سیکھنے کی ضرورت ہے۔۔ کیا عورت کو صرف جنس کے حوالے سے ہی دیکھنا چاہیے۔ کیا وہ جنس کے باہر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مرد کی سوچ ان کی ٹانگوں کے بیچ میں کہیں اٹک جاتی ہے۔ افسوس کی بات ہے۔ اچھا یار سوری! تمھیں بُرا لگا۔ بُرا تو لگا ہے۔ چلو چھوڑو، کھانا کھاؤ۔ پھر گپ شپ کرتے ہیں۔ ناصرہ نے چیزیں لاتے ہوئے سب سُن لیا تھا۔ اُسے رضا صاحب بڑے اچھے، نیک، ہمدرد انسان لگے۔ جو عزت کرتے ہیں۔ اُس کے دل میں ان کی قدر اور بڑھ گئی۔ ایک دن سٹڈی میں بیٹھے اطلاعی گھنٹی بجی۔ کون ہے بھئی آجاؤ۔ انکل میں وجاہت علی۔ ارے بیٹا آجاؤ۔ کہاں ہوتے ہو؟ کبھی ارسلان کے ساتھ گھر آتے تھے۔ اب تو بھول ہی گئے ہو۔ نہیں نہیں انکل ایسی بات نہیں۔ بس ذرا پی ایچ ڈی کے تھیسس کی تیاری میں بزی رہا۔ اب تھیسس جمع ہو گیا ہے۔ سوچا آپ سے خیریت پوچھ لوں اور ارسلان سے کافی دنوں سے رابطہ نہیں ہوا۔ کال بھی اٹینڈ نہیں کر رہا۔ میں نے بھی کافی کوشش کی ہے۔ بس موڈ کا بندہ ہے۔ خود ہی جب موڈ میں آئے گا تو رابطہ کرلے گا۔ جی یہ بھی ٹھیک ہے۔ رضا خان صاحب چائے لے آؤں، اچانک ہی ناصرہ کہیں سے وارد ہوئی۔ ہاں بھئی ناصرہ۔ ساتھ کچھ کھانے کو بھی لے آؤ۔ یہ ارسلان بابا کے دوست ہیں۔ نہیں انکل اس کی کیا ضرورت ہے۔ ارے کیوں نہیں۔ رضا خان نے اصرار کیا۔ ناصرہ

آ ڈر لے کر چلی گئی۔ اور بیٹے تمہارے بابا کیسے ہیں۔ کچھ بیمار ہیں آج کل۔ بس ریٹائرڈ لائف کی پریشانی۔ ہاں بھئی۔ انکل یہ خاتون کون ہیں۔ یہ نئی میڈ رکھی ہے۔ میرا خانساماں بغیر بتائے چلا گیا ہے۔ تو آپ نے پتہ نہیں کیا۔ بہت مرتبہ فون کیا کوئی اُٹھاتا ہی نہیں۔ اُس کے گھر کا مجھے پتہ نہیں۔ ہاں ہم نے اُس کے ہاتھ کی بہت سی چیزیں کھائی ہیں۔ وجاہت نے خانساماں کو یاد کیا۔ چلو ایک مرتبہ پھر اُس کا نمبر ٹرائی کرتا ہوں اور پورے ڈیڑھ مہینے بعد اچانک ہی نمبر مل گیا۔

کون بات کر رہا ہے؟ مجھے محمد علی سے بات کرنی ہے۔ وہ میرے ہاں کام کرتا تھا۔ آپ رضا صاحب بات کر رہے ہیں۔ دوسری طرف سسکیاں سُنائی دینے لگیں۔ وہ تو ڈیڑھ ماہ پہلے ایک ایکسیڈنٹ میں وفات پا گیا تھا۔ سسکیاں تیز ہوئیں اور رضا صاحب دکھی ہو گئے۔ مجھے بتانا تو چاہیے تھا۔ اتنا پرانا ملازم تھا۔ میں نے کئی مرتبہ فون کیا۔ کوئی اُٹھاتا ہی نہیں تھا۔ رضا صاحب نے شکوہ کیا۔ سر اُس کا موبائل بھی دو دن پہلے ہی ملا ہے۔ گم ہو گیا تھا۔ اچھا مجھے ایڈریس بتائیں۔ میں تعزیت کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ فون بند ہو گیا۔ یار یہ تو بُرا ہوا۔ ابھی جوان آدمی تھا۔ جی انکل دُکھ ہوا سُن کر۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ او کے۔ میں جاؤں گا اُس کے گھر کچھ مدد کروں گا اُن لوگوں کی۔ اُس نے آخر بہت خدمت کی ہے میری۔ جی انکل ضرور ایسا ہونا چاہیے۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ وہ مُسکرایا۔ سلامت رہو میرے بچے۔

ہفتے بھر بعد ہی ارسلان کا وڈیو کال موصول ہوا۔ بابا آپ نے گھر میں عورت رکھ لی ہے۔ ہاں بیٹا اُس نے بڑے اچھے سے گھر سنبھال لیا ہے۔ خانساماں بے چارہ وفات پا گیا ہے۔ کچھ تو کرنا تھا ناں۔ تو بابا کوئی اور خانساماں رکھ لیتے۔ بیٹے آپ کو کیا اعتراض ہے۔ آپ امریکہ میں بیٹھ کر مجھ پر اعتراض کریں گے۔ جیسے تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو۔ میں بھی تو تمہارا باپ ہوں۔ رضا خان کو غصہ آ گیا۔ سوری بابا۔ میرا مطلب گھر پر قبضہ ہی نہ جما لے۔ بیٹے آپ لوگوں کو سب جائیداد میں مناسب حصہ مل چکا۔ یہ میرا گھر میری کمائی اور پسند سے بنا ہے اور یہ میں جسے چاہوں گفٹ کروں۔ اس پر آپ کا اعتراض بنتا ہی نہیں۔ مہینوں بعد فون کر کے باپ کی خیریت دریافت کرنے کے بجائے آپ کو گھر کی پڑی ہے۔

بابا آپ ہمارے بابا ہیں۔ آپ کی فکر ہو رہی تھی۔ ارے ماشا اللہ میرے چاند! ماں کی صورت تو دیکھنے آ نہیں سکے تھے۔ جس نے آپ کی خاطر زندگی لٹا دی۔ اور میری فکر ہونے لگی۔ رضا خان کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ بیٹا جی آپ اپنی زندگی میں مگن اور خوش رہیں۔ یہ معاہدہ طے پا گیا تھا۔

اور میں نے اپنی زندگی میں مداخلت کا

اِختیار آپ کو نہیں دیا۔ رہی اِس عورت کی بات تو میں اُس کے کام سے خوش ہوں۔ گھر کی بابت تم فکر نہ کرو۔ شایان سے کبھی ملاقات ہو تو بتانا ایک عدد باپ بھی پاکستان میں رہتا ہے۔ جسے پلٹ کر بھی دیکھا نہیں تم لوگوں نے۔ حتیٰ کہ بیلی بھی مصروف ہو چکی ہے۔ تین ماہ سے اُس نے کال نہیں کی۔ اللہ ایسی خودغرض اولاد پر رحم کرے۔ خوش رہو۔ اللہ حافظ۔ رضا نے کافی تلخی سے فون بند کر دیا۔ اچھی محبت اور خبر گیری ہے کہ باپ نے عورت کیوں رکھ لی۔ وقت اپنی رفتار سے سرکتا رہا۔ رضا صاحب کو کسی دوست کی طرف جانا تھا۔ وہ چلے گئے۔

ناصرہ گھر کے جملہ اُمور طے کر کے، کھانا بنا کر، بچے کے ساتھ گارڈن میں چلی آئی۔ دُھوپ چھاؤں کا بڑا سُہانا منظر تھا، وہ بچے کے ساتھ کھیلنے لگی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اچانک اُس کی ہنسی کی آواز ہوا کے دوش پہ لہراتی رضا کے کانوں تک پہنچی۔ وہ ابھی ابھی باہر سے آئے تھے۔ اُنھوں نے سٹڈی کی کھڑکی سے جھانکا جہاں گارڈن کا سارا منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دُھوپ چھاؤں کے منظر میں کھلے بالوں کے ساتھ حسین چہرہ لیے وہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق نظر آتی تھی۔

پینسٹھ برس کی عمر تجربے، مشاہدے اور حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ایک ملازمہ آخر کتنی حسین نظر آ سکتی ہے۔ اُنھوں نے سوچا مگر یہ حقیقی منظر تھا۔ کیا یہ واقعی ایک غریب عورت ہے۔ یا اِس نے سوانگ بھر رکھا ہے۔ اپنے چہرے مہرے، حلیے، رکھ رکھاؤ، آداب، شائستگی، پڑھا لکھا ہونا قطعاً یہ ظاہر نہیں کرتے تھے کہ وہ کوئی معمولی عورت ہے۔ وہ تھی بھی بڑی دراز قد اور جوان اور میں شدید بوڑھا ہوتا ہوا ایک آدمی۔ رضا خان نے سر جھٹکا۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ میری پناہ میں ہے۔

وہ ان حسین خیالوں کو جھٹک کر اخبار کے مطالعے میں گم ہو گئے۔ سر کھانا لگ گیا ہے۔ یہ کوئی جادوگر کی بچی ہے کہ فٹافٹ سب تیار۔ ہاں آپ کھانا لگاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔ وہ اپنی خوشبو وہاں چھوڑ گئی تھی۔ کیا کروں۔ اب یہ میرے لیے آزمائش اور پھندا بنی رہے گی۔ چلو اس کی شادی کروا دیتا ہوں۔ اُنھوں نے بہترین حل سوچ لیا۔ کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ ابھی بیٹھے اور نیپکن پکڑا ہی تھا کہ وہ ایک اور ڈش رکھنے آئی۔ ناصرہ۔ جی صاحب۔ اِدھر بیٹھو۔ نہیں نہیں صاحب۔ آپ بات کیجیے۔ تم بیٹھو پھر بات کرتا ہوں۔ آؤ آج میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ نہیں رضا صاحب۔ ناصرہ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔ آپ مالک ہیں۔ میں ملازم۔ آپ کے برابر نہیں بیٹھ سکتی۔ یہ فرسودہ باتیں ہیں۔

یہ جدید دور ہے۔ انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ سب برابر ہیں۔ تم سے کچھ بات کرنی تھی۔ بیٹھو۔ جی رضا صاحب۔ وہ سائیڈ والی

کرسی پر بیٹھ گئی۔ کھانا ڈالو۔ جی۔ اُس نے جلدی سے کھانا نکالا۔ تھوڑا سا اپنے لیے بھی نکالا۔ بیٹا کدھر ہے۔ سو گیا ہے۔ کافی کھیلا آج۔ اِس کے کھانے پینے کا خیال رکھا کرو۔ جی صاحب رکھتی ہوں۔ آپ کا شکریہ۔ سب کچھ آپ کا ہی تو دیا ہوا ہے۔ میرا نہیں۔ رضا نے سختی سے تردید کی۔ خدا کا دیا ہوا ہے۔ جی صاحب۔ اگر تمھیں بُرا نہ لگے تو آپ کی شادی کی بات کروں کسی سے، کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر۔ آپ ابھی جوان ہیں۔ خوب صورت ہیں۔ کب تک گھروں میں کام کریں گی۔ آپ کا اپنا گھر ہونا چاہیے۔ وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے چُپ رہی۔ میں شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنے بچے کی حفاظت کرنی ہے۔ اس کے باپ کے قاتل اِسے بھی مار ڈالیں گے۔ وہ ہماری تلاش میں رہتے ہیں۔ بڑے مسائل ہو جائیں گے۔ آپ کچھ بتائیں گی اپنے بارے میں۔ تب ہی تو آپ کی مدد کر پاؤں گا۔ کسی اچھے شخص سے شادی ہو گئی تو وہ بخوبی آپ لوگوں کی حفاظت کر پائے گا۔

ایک بات کہوں۔ کہو۔ رضا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ ناصرہ نے کہا۔ نہیں بولو۔ سُن رہا ہوں۔ آپ کی بیوی نہیں، اتنا بڑا گھر خالی پڑا ہے۔ اور آپ اکیلے ہیں۔ آپ کو بھی تو سہارے کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے بارے میں ایسا کیوں نہیں سوچتے۔

آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ ذرا سنبھل کر بولے۔ مگر میں نے زندگی کا بہترین وقت بہترین طریقے سے گذار لیا ہے۔ اب کوئی طمع، کوئی لالچ نہیں ہے اور ضرورت بھی نہیں ہے۔ اُنھوں نے پوری قطعیت سے انکار کیا۔ میں نے بھی بہترین وقت گذار لیا۔ اب کوئی خواہش نہیں۔ بیٹے کو پالوں گی۔ بس، اُس نے بھی قطعی فیصلہ سُنایا اور اُٹھ گئی۔

یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ وہ کتنی ہی دیر سوچتے رہے۔ جوان عورت ہے اور اِس گھر میں دوسری کوئی عورت نہیں۔ کل کلاں کو لوگ باتیں بنائیں گے۔ یکدم اُنھیں اس بات کا احساس ستانے لگا۔ دوستوں کے رویے سے وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ لوگ کیا سوچتے ہیں۔ وہ کتنی ہی دیر سوچ میں ڈوبے رہے۔ ناصرہ اُنھیں کچن کی کھڑکی سے مسلسل دیکھتی رہی۔

رضا صاحب نے مجھے گھر سے نکال دیا تو کہاں جاؤں گی۔ وہ سوچتی چلی گئی۔ بچے کو بچانا ہے۔ خود کو بھی بچانا ہے۔ زمانہ اور حالات بہت بُرے ہیں۔ رضا صاحب بے شک اکیلے ہیں۔ پیسے والے ہیں۔ مگر وہ مجھے اپنائیں گے نہیں کہ ان کا سٹیٹس خراب ہو گا۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔

میں ایک غریب عورت۔ ایک ملازمہ۔ ایک بچے کی ماں۔ وہ گہری سوچ میں گم تھی، جب اچانک رضا صاحب اُدھر آ نکلے۔ ناصرہ۔ وہ چونک گئی۔ جی رضا صاحب۔ چائے کا کپ سٹڈی روم میں بھجوا دو۔ جی صاحب۔ ابھی لائی۔ اُس نے سعادت مندی اور عقیدت سے کہا۔ رضا صاحب

میرے لیے کتنا اچھا سوچتے ہیں۔ یہ کوئی ایسے بڈھے بھی نہیں ہیں۔ شاندار پرسنیلٹی ہے کم از کم مجھے تو پسند ہیں۔ اتنے مہربان۔ اتنے شفیق۔ وہ چائے بناتے ہوئے اُنھی کے بارے سوچنے لگی۔ کیا مصیبت ہے۔ اُس نے ذہن کو جھٹکا۔ یہ میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ بھلا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند بھی لگا ہے۔ وہ چائے بنا کر سٹڈی میں پہنچی۔ رضا صاحب لیپ ٹاپ پر جھکے کسی کام میں مگن تھے۔ چائے۔ ہاں رکھ دو۔ وہ اتنے بے خبر بھی نہیں تھے۔ اُس نے کچھ کاغذ ہٹا کر جگہ بنائی اور چائے رکھ دی۔

وقت کی ریت دھیرے دھیرے پھسلنے لگی۔ ایسے ہی ایک روشن دن میں اچانک اُنھیں کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز سُنائی دی۔ کون ہے باہر۔ دیکھتا ہوں۔ وہ باہر نکلے تو سامنے ہی مسز جمشید کھڑی تھیں۔ میجر (ر) جمشید علی کی بیگم۔ جو اپنی بیوہ بہن کا گھر بسانے کے لیے کئی مرتبہ ملتے ملاتے اشاروں کنایوں میں رضا صاحب سے ذکر کر چکی تھیں۔ رضا صاحب کی سرد مہری دیکھ کر وہ چپ ہو جاتیں۔

مسز جمشید کیسی ہیں آپ۔ آج کیسے آنا ہوا۔ رانی حمیدہ آئی ہوئی ہیں کراچی سے۔ آپ کو پتہ ہے وہ سکول چلا رہی ہیں کراچی میں۔ آپ سے ملوانا چاہتی تھی۔ کیوں؟ وہ گڑبڑائے۔ وہ آپ سے کئی دفعہ ذکر کیا ہے۔ کب تک اکیلے رہیں گے۔ دیکھیے مسز جمشید میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ میری معذرت قبول کریں۔ جی رضا صاحب جب ایک جوان خوبصورت ملازمہ مفت میں مل جائے گی۔ تو آپ کیوں ایسا سوچیں گے۔ مسز جمشید کے اس طنزیہ جملے پر وہ تپ ہی گئے۔ الزام لگانا شیطان کا کام ہے۔ آپ چلی جائیں یہاں سے۔ میں اس پر مزید کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ مسز جمشید بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

ناصرہ بے چین اور شرمندہ سی کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں یقیناً آنسو بھی تھے۔ مجھے افسوس ہے رضا صاحب۔ میری وجہ سے۔ نہیں ناصرہ۔ آپ کی وجہ سے نہیں۔ یہ خاتون پچھلے دو سال سے مجھے پریشان کر رہی ہے۔ لالچی عورت ہے۔ اور اس کی لالچی بہن سے میں ہرگز نکاح نہیں کر سکتا۔ وہ ضرور اس گھر پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ مجھ سے اُنھیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہر بندے کا کوئی نہ کوئی لالچ تو ہوتا ہے ناں۔ رضا صاحب نے چونک کر اُسے دیکھا۔ تم جاؤ۔ کام کرو۔ میں بہت اُلجھ گیا ہوں۔ بندہ مر رہا ہو تو کوئی پوچھتا نہیں اور ہوس میں لوگ اندھے ہو جاتے ہیں۔

وہ باغیچے میں جا بیٹھے۔ ننھا رضوان وہیں چلا آیا۔ تو وہ اُس سے باتیں کرنے لگے۔ اُسے ٹافیاں دینے لگے۔ اُن کا ذہن کافی حد تک بہل گیا۔ اُنھیں اکیلے ہی فیصلہ کرنا تھا۔ اس زندگی میں اُن کی اُلجھنوں کا فیصلہ۔ مجبوری ہے کہ میں ناصرہ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ مگر لوگ اِک جوان عورت کو گھر میں رکھنے پر شک کرتے رہیں گے۔ رضا

صاحب نے صفی الدین کو کال کر کے گھر بلایا اور اس مسئلے پر کافی دیر تک بات کرتے رہے۔ دیکھو رضا خان اگر ناصرہ خاتون راضی ہو تو تم اُس سے نکاح کر لو۔ یہ گناہ تو نہیں۔ اُسے گھر اور تحفظ مل جائے گا۔ اُس کا بچہ بھی محفوظ ہو جائے گا۔ تمھاری اُداسی اور تنہائی بھی دُور ہو جائے گی۔ ویسے بھی اُس نے بہت عمدگی سے اس گھر کو سنبھال لیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ پہلے اُس سے پوچھو تو۔ مجھے بتا دینا۔ میں نکاح کا انتظام کر لوں گا۔ ٹھیک ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی رضا صاحب کو یہ بڑا فیصلہ لینا پڑا۔

وہ آتش دان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ناصرہ کافی لے آئی۔ بیٹھو ناصرہ۔ ضروری بات کرنی ہے۔ جی رضا صاحب۔ کہیے۔ آپ زمانے کی اُونچ نیچ سے واقف ہیں۔ میری اُلجھنوں اور مسائل سے بھی۔ ایک جوان عورت کو اس گھر میں لوگ رہنے نہیں دیں گے۔ مفت کی بدنامی ہاتھ آ رہی ہے۔ آپ بھی کہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ اگر آپ اس بات پر رضا مند ہوں۔ تو آپ سے عقد ثانی کرنا چاہتا ہوں۔ تا کہ آپ اور آپ کا بچہ دونوں محفوظ ہو جائیں۔ گھر مل جائے۔ میں خود اپنے لیے نہیں آپ کے بارے میں فکر مند ہوں۔

بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔ آپ انکار بھی کریں گی تو مجھے حیرت نہیں ہوگی۔ یہ آپ کا حق ہے۔ اس گھر میں تحفظ اور احترام آپ کو حاصل رہے گا۔ وہ سر جھکائے شعلوں کو جلتے بجھتے دیکھتے رہے۔ بالکل خالی الذہن تھے۔

اچانک ہی ناصرہ نے ہاتھ بڑھا کر رضا خان کا ہاتھ اپنے نرم گرم ہاتھوں میں لے لیا۔ یہ اچانک حملہ تھا۔ رضا اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ جیسے کرنٹ لگا ہو۔ یا کسی چنگاری نے اُڑ کر اُنھیں تڑپا دیا ہو۔ رضا صاحب مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے۔ آپ کو کبھی میری وجہ سے پریشانی نہیں ہو گی۔ آپ کی خدمت میرا فرض۔ آپ کا شکریہ۔ آپ نے ایک دُکھی، غریب اور بیوہ عورت کو سہارا دینا پسند کیا۔ اُس نے رضا کے ہاتھ پر اپنے گرم ہونٹوں کا بوسہ ثبت کیا اور تیزی سے اُٹھ گئی۔ وہ حیرت سے اُسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ کیسی آگ لگا گئی تھی۔ اس کا مطلب کہ وہ پہلے ہی ذہن بنا چکی ہے اُسے اور کیا چاہیے۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ مسز آصف رضا خان بن کے اُن کے ذاتی بیڈ روم میں موجود تھی۔ حجاب کے بغیر سادہ سے پنک سوٹ میں وہ قیامت لگ رہی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی خوب صورت ہو۔ میں آپ کے لیے آپ کے صبر اور استقامت کا انعام ہوں۔

وہ اُن کے مضبوط بازؤں میں سما گئی۔ رضا اُس کی حسین زلفوں میں منہ چھپائے کتنی ہی دیر اپنے ہونے کا یقین کرتے رہے۔ وہ جانتے تھے۔ یہ فیصلہ بھی آسمانوں پر کہیں پہلے ہی لکھا جا چکا تھا۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ وہ دونوں اس فیصلے سے خوش تھے۔

☆☆☆☆☆

کربناک زیست

شام کا سایہ کمرے کی دیواروں پر رینگتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا جیسے ماضی کی پرچھائیاں دوبارہ زندہ ہو رہی ہوں۔ کھڑکی سے چھن چھن کر آتی زرد دھوپ، دھول سے اٹے فرش پر عجیب سی اداسی بکھیر رہی تھی۔ پرانے پنکھے کی سست گردش جیسے ہر لمحہ ایک آہ بن کر گونجتی تھی۔ روحینہ اسی کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھ کر خالی آنکھوں سے آئینے کو دیکھ رہی تھی ــــ وہی آئینہ، جو برسوں سے دیوار پر ٹنگا تھا، مگر اُس میں عکس اب نظر نہیں آتے تھے، صرف سوال رہ گئے تھے۔

کمرے کی الماریاں بند تھیں۔ ہر دراز میں یادیں قید تھیں۔ بند کتابیں، پرانی تصویریں، پھیکی پڑ چکی خوشبوئیں... سب جیسے اس کمرے کے ساتھ ساکت تھیں۔ اور روحینہ ... وہ تو شاید خود بھی اسی کمرے کی ایک چیز بن چکی تھی ــــ خاموش، نظرانداز، گردآلود۔

روحینہ کی آنکھوں میں ایک ہلکی نمی تھی، مگر آنسو بہنے سے انکاری۔ اس نے اپنے دل میں کئی موسم دفن کیے تھے، لیکن ایک موسم ایسا تھا جو ہر لمحہ اس کی سانسوں میں گونجتا رہتا تھا: صائم۔

’’صائم، کیا تم واقعی ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے؟‘‘

روحینہ کی آواز میں وہی لرزتی امید تھی جو ہر محبت میں جنم لیتی ہے۔

صائم نے ہلکا سا مسکرا کر کہا، ’’روحینہ، اگر دنیا صرف ہم دو کا خواب ہوتی... تو ہاں، ہمیشہ۔‘‘

اور وہ لمحہ... ایک جھوٹے خواب کی طرح روحینہ کی روح میں اتر گیا۔

ماں کی آواز دروازے کے اُس پار سے آئی:

’’روحی! ذرا چائے رکھ آنا باہر۔ مہمان آئے ہیں۔‘‘

روحینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ لمحے بعد دروازہ کھلا اور ماں اندر داخل ہوئی۔ اُس نے روحینہ کی طرف دیکھا، جو آئینے سے نظریں ہٹائے بغیر بیٹھی تھی۔

’’کیا بات ہے تمھیں؟ کب تک یوں بیٹھے رہو گی؟ سب کچھ بھول جاؤ۔ زندگی ایسے نہیں چلتی۔‘‘

روحینہ نے آہستہ سے سر اُٹھایا۔

’’امی، کیا زندگی واقعی چلتی ہے؟ یا ہم اُسے صرف گھسیٹتے ہیں؟‘‘

ماں کے چہرے پر ناپسندیدگی اور بے بسی کا عجیب امتزاج تھا۔

’’یہ سب فضول باتیں چھوڑو۔ لڑکیوں کو ایسے نہیں سوچنا چاہیے۔ عزت، خاندان، روایتیں...‘‘

روحینہ نے بات کاٹ دی:

’’امی، روایتیں کیا ہوتی ہیں؟ احساس کو دفن کرنے کا بہانہ؟‘‘

ماں خاموش ہوگئی۔ جیسے اُس کے پاس الفاظ نہیں تھے یا شاید جذبات کا قرض چکانے کی

کومل شہزادی

ہمت نہیں تھی۔
رات جب چھت پر ہوا چلتی، تو کمرے کے در و دیوار بولنے لگتے۔ پرانا آئینہ، جو دن بھر خاموش رہتا، رات کو جیسے روحینہ سے سرگوشیاں کرتا:
"تم اب بھی زندہ ہو... مگر زندگی کہاں ہے؟"
روحینہ نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔
اندر ایک طوفان تھا، مگر باہر مکمل خاموشی۔
یہی خاموشی اُس کی ہمراز تھی۔ یہی اس کی "کربناک زیست"۔
رات کے پچھلے پہر کمرے کی خاموشی میں صرف پنکھے کی گھومتی آواز باقی رہ گئی تھی۔ روحینہ کھڑکی کے پاس کھڑی باہر اندھیرے کو دیکھ رہی تھی، جیسے رات کے سینے میں اپنے درد کی تصویریں تلاش کر رہی ہو۔
درختوں کے سائے ساکت تھے، جیسے ہر شے نے اُس کی تنہائی کا احترام کرنا سیکھ لیا ہو۔
دل میں ایک بار پھر صائم کی آواز گونجی —
"مجھے معاف کر دینا، روحی... میں مجبور ہوں۔"
اُس دن جب صائم آیا تھا، اُس کی آنکھوں میں عجیب سا ہچکچاہٹ تھی۔
"میں نے امی ابو سے بات کی تھی... وہ نہیں مانے۔ تم جانتی ہو روحی، ہم ایک جیسے نہیں ہیں۔ ہمارا تعلق، ہمارے خواب... بس خواب ہی تھے۔"
روحینہ نے اُس کی بات سنی تھی، جیسے کوئی سزاوار خاموشی سن رہا ہو۔
"تو کیا ہم بس خواب تھے، صائم؟ تم نہیں لڑ سکتے تھے؟"
صائم کی آنکھیں جھک گئیں،
"تم نہیں سمجھو گی... ماں باپ، سماج، رسمیں..."
روحینہ کی آنکھوں سے پہلی بار ایک آنسو پھسل کر گری،
"نہیں صائم، میں سب سمجھ گئی ہوں۔"
روحینہ کی ماں کی تکرار اب جیسے معمول بن گئی تھی:
"کب تک تم اس ایک بات پر بیٹھے رہو گی؟ تمھاری عمر نکلتی جا رہی ہے، لوگ کیا کہیں گے؟"
لیکن روحینہ کے لیے "لوگ" اب بس ایک شور تھے — بے معنی، اجنبی، اور بے رحم۔
ایک دن جب وہ الماری صاف کر رہی تھی، پرانی ڈائری ہاتھ لگی۔ اُس نے ایک صفحہ کھولا، جہاں صائم کا لکھا ایک جملہ اب بھی واضح تھا:
"اگر ہم نہ مل سکے، تو بھی تم میری شاعری میں زندہ رہو گی۔"
روحینہ نے ڈائری بند کر دی۔
"محبت صرف شاعری میں کب تک زندہ رہ سکتی ہے، صائم؟ دل کی دراڑیں لفظوں سے نہیں بھرتیں۔"
صبح کی پہلی کرن جب کھڑکی سے اندر داخل ہوئی، تو کمرے میں ایک عجیب سی تازگی کا احساس ہوا۔ پنکھا اب بھی گھوم رہا تھا، الماری کی درازیں اب بھی بند تھیں، مگر روحینہ... وہ آج کچھ بدلی بدلی سی تھی۔
شاید خاموشی کے اس طویل سفر میں وہ کسی نامعلوم کنارے پر آ چکی تھی — جہاں نہ

صائم کی جدائی کی چیخ تھی، نہ ماں کے روایتی تقاضے، بل کہ بس ایک خاموش قبولیت... اور ایک ہلکی سی روشنی۔

صبح کا آئینہ آج جیسے کچھ اور دکھا رہا تھا۔

روحینہ نے خود کو بغور دیکھا۔ آنکھوں میں وہی اداسی تھی، مگر اُس کے نیچے اب کوئی نرمی سی تھی... جیسے درد کی تہہ میں ہمت کی ایک کرن پل رہی ہو۔

''کیا میں ہمیشہ اسی کمرے کی قیدی رہوں گی؟ یا اب وقت ہے کہ میں خود کو آزاد کر دوں؟''

اس سوال نے اُس کے اندر ایک ارتعاش پیدا کیا۔ پہلی بار اُس نے سوچا کہ زندگی کو جینے کے لیے شاید کسی کے ساتھ یا کسی سماج کی منظوری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

شاید زندگی وہ ہوتی ہے جو ایک عورت خود اپنے لیے تراشے... کرب کے سنگ تراش سے۔

روحینہ نے الماری کھولی۔ اندر وہی پرانی ساڑھیاں، بچپن کے کپڑے، کچھ یادگار خط۔ اُس نے ایک شال نکالی — جو کبھی صائم نے دی تھی۔ اُسے آہستہ سے پکڑا، دیکھا، اور پھر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

شال ہوا میں اڑی، نیچے گری، اور جیسے کسی پرانے خواب کا کفن بن گئی۔

پھر اُس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال کھولے۔

خاموشی سے ایک چیخ نکلی... مگر یہ چیخ زبان کی نہیں تھی، یہ ایک اندرونی بغاوت کی بازگشت تھی۔

ماں جب کمرے میں آئی، تو روحینہ کھڑکی کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ سب خیریت ہے؟''

روحینہ نے پہلی بار بغیر جھجکے کہا:

''امی، میں خود کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔ شاید میں یہاں نہیں ہوں، شاید یہ کمرہ اب میرا نہیں رہا۔''

ماں نے چونک کر کہا، ''کیا مطلب؟ کہاں جا رہی ہو؟''

روحینہ کے چہرے پر ایک عجیب سکون تھا۔

''کہیں نہیں... بس خود کے اندر جا رہی ہوں۔ جہاں میرے سوالوں کا جواب، میری خاموشی کے لفظ، اور میری زیست کی معنویت چھپی ہے۔''

شام کا سورج غروب ہونے کو تھا۔ مگر آج کمرے میں زرد روشنی کے ساتھ ایک فیصلہ کن چمک بھی تھی۔ روحینہ نے ایک نئی ڈائری کھولی، اور لکھا:

''میری زیست کربناک تھی... مگر اُس کرب سے جنم لینے والی روشنی میری اپنی تھی۔ اب میں جینے جا رہی ہوں — اپنے ہونے کے شعور میں۔''

''کربناک زیست'' صرف روحینہ کی کہانی نہیں، بل کہ ہر اُس وجود کی داستان ہے جو سماج کی توقعات، محبت کی ناتمامی، اور رشتوں کی خود غرضی میں گھٹتا ہے مگر جس لمحے وہ وجود خود کو پہچان لیتا ہے، وہی لمحہ خاموشی کے بند دروازے کو توڑ کر زندگی کی نئی راہ کھولتا ہے۔''

☆☆☆☆☆

برف کی اوٹ میں جلتی ہوئی آگ

شہر کی صبح ہمیشہ کی طرح یکسانیت کا شکار تھی جیسے کسی نے گھڑی کی سوئیوں کو انسانی سانسوں سے باندھ رکھا ہو۔ ہر روز، وہی دھند میں لپٹی سڑکیں، وہی تیز رو ٹریفک، اور وہی چہرے جو زندگی نہیں، معمول دہرا رہے تھے۔ ذیشان بھی انہی چہروں میں ایک چہرہ تھا۔

صاف ستھری قمیض، ٹھیک سے استری شدہ پتلون، ہاتھ میں لیپ ٹاپ کا بیگ، اور آنکھوں کے گرد وہ دائرے جو ہر روز کی تھکن سے بنے تھے۔ اس کے قدم جیسے کسی نادیدہ تال پر چل رہے تھے، ایسی تال جس میں کوئی نغمہ نہیں، صرف ترتیب ہو۔ بس اسٹاپ پر لوگوں کا ہجوم تھا، مگر وہاں کوئی موجود نہیں تھا، صرف جسم تھے، جو اپنی اپنی سمتوں میں بھاگنے کے لیے کھڑے تھے۔

ذیشان نے گھڑی دیکھی۔ سوئیاں وقت نہیں، تھکن ناپ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو اسے لگا جیسے شہر سانس لینا بھول گیا ہے۔ دھواں، شور، اور ایک ایسی خاموشی جو انسان کے اندر جا کر چیختی ہے۔

"یہ دن بھی کیسے کٹے گا؟" اس نے زیر لب کہا۔ پھر سر جھکا کر بس میں سوار ہو گیا، جہاں سب مسافر اپنی اپنی قید میں گم تھے۔ کھڑکی کے باہر صبح کا اجالا پھیل رہا تھا، مگر اندر ذیشان کے چہرے پر روشنی کا کوئی نشان نہ تھا۔ گویا دن طلوع نہیں ہوا، بس اندھیرے نے ذرا سا رنگ بدل لیا ہو۔

اس کی شادی کو دو برس ہو چکے تھے۔ شبانہ اور ذیشان کی زندگی میں سکون تھا لیکن وہ سکون جس میں نہ ہنسی تھی نہ رنگ، بس ایک مسلسل یکسانیت۔ دونوں بچے سے محروم تھے، اور شاید اسی خلا نے ان کے درمیان ایک غیر محسوس دیوار کھڑی کر دی تھی۔ گھر میں ان کی باتیں اکثر موسم یا کھانے کے ذائقے سے آگے نہ بڑھتی تھیں۔

رات کو ذیشان اکثر دیر تک جاگتا رہتا، کبھی کھڑکی سے باہر سڑک کو دیکھتا یا کتاب کے اوراق الٹتا۔ شبانہ اپنی معمول کی عبادات کے بعد جلدی سو جاتی۔ وہ اپنی پرسکون نیند میں ڈوبی رہتی اور ذیشان اپنے بوجھل

وسیم جبران

خیالات کے ساتھ جاگتا رہتا۔ انہی راتوں میں سے ایک رات، جب بارش کی ہلکی بوندیں کھڑکی کے شیشے پر بج رہی تھیں اور کمرے میں گھڑی کی سوئیاں مدھم آواز کے ساتھ وقت کو چیر رہی تھیں، ذیشان نے فیس بک کھولی۔

یونہی اسکرول کرتے کرتے ایک پروفائل پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ تصویر میں ایک لڑکی تھی۔ جینز اور ٹاپ میں، کھلے بالوں کے ساتھ، آنکھوں میں شوخی۔ اس نے سکرول کیا۔ اس ماڈرن سی لڑکی کی چند تصاویر تھیں، مسکراتی ہوئی، کھلے بال، کہیں گٹار ہاتھ میں، کہیں کسی کیفے کے کونے میں بیٹھے ہوئے۔ یہ سب کچھ ذیشان کی اپنی زندگی سے بالکل مختلف تھا۔ جیسے کسی دوسرے جہان کی جھلک۔ پروفائل پر اس کا نام شبو لکھا تھا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ نہ جانے یہ لڑکی کون ہے، کہاں رہتی ہوگی، گٹار کی کئی تصاویر میں موجودگی ظاہر کرتی ہے اسے موسیقی سے شغف ہے۔ اسے اپنے لڑکپن کے دن یاد آگئے جب اس نے اپنے ابا سے گٹار خریدنے کی فرمائش کی تھی اور اس کے باپ نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ہینڈز فری لگا کر گانے سنتا تھا۔

بس ایک لمحے کی رو میں، اس نے سوچا کیوں نہ میں اسے فرینڈ ریکویسٹ بھیجوں، پھر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ لڑکی خاصی ماڈرن لگتی ہے اور میری نیوز فیڈ میں چند بورنگ پوسٹس کے سوا کچھ نہیں۔ کیوں نہ میں ایک ایسی آئی ڈی بناؤں جو اس لڑکی کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ اس نے موسیقی سے شغف رکھنے والے ایک نوجوان کی چند تصاویر تلاش کی جن میں وہ گٹار اور دیگر موسیقی کے آلات کے ساتھ دکھائی دیتا تھا۔ ذیشان نے اس فیک پروفائل میں اپنا نام ''شانی'' رکھا تھا۔ پھر اس لڑکی کو فرینڈ ریکویسٹ بھیج دی اور یہ وہ لمحہ تھا جب برف کے نیچے دبی ہوئی چنگاری نے سانس لی۔

یہ صرف ایک کھیل تھا، ایک وقت گزاری۔ وہ جانتا تھا کہ صبح سب کچھ ویسا ہی ہوگا۔ دفتر، فائلیں، اور شام کی اداسی۔ اگلی صبح دفتر کا ماحول ہمیشہ کی طرح تھکا دینے والا تھا۔ کی بورڈ کی ٹک ٹک، ایئر کنڈیشنر کی مسلسل ہلکی سی گونج، اور فائلوں کے ڈھیر کی مخصوص بو۔ ذیشان نے ایک لمبی سانس لی، کام کے درمیان چند لمحوں کی فرصت ملی تو بے دھیانی سے کیے گئے ایک کلک سے فیس بک کھل گئی۔ نیلی اسکرین پر ایک اطلاع جگمگا رہی تھی۔ ''شبو ایکسیپٹڈ یور فرینڈ ریکویسٹ۔'' ایک لمحے کو وہ ٹھٹک گیا۔ دفتر کی روشنی کچھ دھندلی سی محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم آیا، جیسے کسی منجمد منظر میں کوئی ننھی چنگاری جل اٹھی ہو۔ وہ آگے جھک کر اسکرین دیکھنے لگا۔ اس کے دل نے

دھیرے سے کہا۔
”یہ کھیل شاید مجھے تھوڑا سا زندہ کر دے۔“
اور اس نے پہلی بار ”شبو“ کو میسنجر پر پیغام لکھا۔ ایک سادہ، بے ضرر سا سلام۔ ”ہائے شبو۔“ لیکن برف کے نیچے کہیں آگ سانس لینے لگی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا شاید اس ہیلو کا جواب نہ آئے لیکن پھر حیرت انگیز طور پر جواب آ گیا۔ ایک مختصر سا رپلائی۔ ”ہائے شانی۔“
دل کے کسی کونے میں ہلکی سی شرمندگی بھی تھی۔ یہ سب بچگانہ سا لگتا ہے۔ اس نے خود سے کہا۔ مگر پھر سوچا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔
چند منٹ گزرے۔ پھر نیلی اسکرین پر ایک چھوٹا سا دائرہ ابھرا۔ ”شبو از ٹائپنگ۔۔“
وہیں دل جیسے رک سا گیا۔ دنیا کے سارے شور کے بیچ صرف وہ ایک لائن دکھائی دے رہی تھی۔ پھر پیغام نمودار ہوا۔
”شانی! کیا تمہیں موسیقی پسند ہے؟“
ذیشان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ دفتر کی گھٹن ذرا کم محسوس ہوئی۔
”ہاں، شاید اسی نے بچا رکھا ہے مجھے، ورنہ یہ دنیا کب کی بجھ چکی ہوتی۔“ شبو نے جواب دیا۔
”واہ، یہ بات تو شاعر لوگ کرتے ہیں۔ تم گٹار بجاتے ہو؟“
ذیشان نے انگلیوں سے میز پر ہلکی ہلکی ٹک ٹک کی، جیسے کوئی ان دیکھی دھن بجائی ہو۔
”ہاں، کبھی کبھار۔۔ جب دل کو خاموشی کی اجازت نہیں ملتی۔“ پھر شبو کا ہنستا ہوا ایموجی۔
”پھر تو تم خوش نصیب ہو شانی۔ میں نے ہمیشہ چاہا کہ گٹار بجاؤں، لیکن خواب ہمیشہ کسی کو مکمل نہیں ملتے۔“ ذیشان کے دل میں جیسے کوئی نرم سی لہر اٹھی۔ اس نے لکھا۔
”شاید خواب مکمل ہو بھی جائیں تو انسان ادھورا رہ جاتا ہے۔“
شبو کا جواب آیا۔
”یا شاید ہم ادھورے رہنا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ادھورا پن ہی دل کو زندہ رکھتا ہے، ہے نا؟“ ذیشان کچھ دیر خاموش رہا۔ دفتر کی دیواروں کے پیچھے جیسے کوئی ان دیکھی دنیا سانس لے رہی تھی۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی اور لکھا۔
”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ادھورے لوگ ہی کہانیاں لکھتے ہیں۔“
اسکرین پر کچھ دیر ٹائپنگ لکھا جاتا رہا۔ پھر پیغام آیا۔
”تو پھر لکھو نا شانی، اپنی کہانی۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں۔“ ذیشان نے مسکرا کر سوچا۔ ”کبھی کبھی زندگی کی سب سے بڑی کہانیاں ایک غلط کلک سے شروع ہوتی ہیں۔“
شام کو دفتر سے واپس آیا تو شبانہ کچن میں مصروف تھی۔ اس نے لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی آن کیا اور خبریں سننے لگا۔ ان کے گھر میں ٹی وی پر صرف نیوز چینل ہی چلتے تھے۔ کچن سے برتنوں کی ہلکی سی کھنک آئی۔ شبانہ

باہر نکلی۔ وہ سبز شلوار قمیض میں تھی، بال ڈھیلے سے باندھے ہوئے۔ چہرے پر کوئی خاص تاثر نہ تھا، بس روزمرہ کے معمول کی طرح ایک خاموشی، جیسے زندگی کا سب سے بڑا کام بس گزر جانا ہو۔

"کھانا لگا دوں؟" اس نے بے دھیانی میں پوچھا۔ ذیشان نے کندھے اچکائے۔

"لگا دو بھوک ہو یا نہ بھی ہو، کھا لیتے ہیں۔"

شبانہ نے پل بھر اسے دیکھا، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو، پھر خاموش ہو گئی۔ وہ اکثر ایسے ہی خاموش رہتی - ان دونوں کے درمیان مکالمے اب صرف ضرورت تک محدود ہو گئے تھے۔ کھانے کی میز پر بیٹھے تو شور صرف چمچ اور پلیٹ کی ٹک ٹک میں تھا۔ ذیشان نے ایک نوالہ منہ میں ڈالا، پھر اچانک کہہ بیٹھا۔

"یہ زندگی تمہیں بور نہیں لگتی؟" شبانہ نے حیرت سے سر اٹھایا۔

"زندگی بور ہو یا خوشی بھری، گزارنی تو ہے نا۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟" ذیشان نے تلخی سے ہنسا۔

"کمی؟ ہاں، شاید رنگوں کی۔ ہر دن ایک جیسا۔ دفتر، گھر، بس۔ کبھی سوچا تم نے، ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کیوں نہیں کرتے جیسے پہلے کیا کرتے تھے؟" شبانہ نے نوالہ نگل کر کہا۔

"باتیں شاید بچی ہی نہیں۔ میں دن بھر گھر میں الجھی رہتی ہوں، تم دفتر کے چکر میں۔ تھکن کے بعد باتوں کے لیے توانائی کہاں بچتی ہے؟" ذیشان نے پلیٹ ایک طرف سرکا دی۔ "شاید یہی تھکن ہمیں نگل رہی ہے۔۔ تمھیں نہیں لگتا ہماری زندگی ایک دائرے میں گھوم رہی ہے؟ ذیشان نے اچانک کہا۔ شبانہ نے نوالہ توڑتے ہوئے نظریں جھکائے رکھیں۔

"ہر شادی ایک دائرہ ہے، ذیشان۔ دن، رات، کھانا، نیند۔ سب گھوم کر وہیں آ جاتا ہے۔ شاید یہی سکون ہے۔" ذیشان ہلکے طنز سے مسکرایا۔

"سکون؟ یا پھر ایک ایسا قید خانہ جسے ہم اپنے ہاتھوں سے تعمیر کر کے قابلِ برداشت بنا لیتے ہیں؟" شبانہ نے پہلی بار نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں نہ غصہ تھا نہ حیرت، بس ایک مدھم سی تھکن۔

"ہر آدمی اپنے قید خانے کو مختلف نام دیتا ہے۔ تم چاہو تو اسے 'یکسانیت' کہہ لو۔ میں چاہوں تو اسے 'استحکام' کہہ سکتی ہوں۔"

کھانے کی میز پر وہ دونوں ہمیشہ کی طرح سادہ سا کھانا کھاتے۔ آج رات آلو کی بھجیا اور روٹیاں تھیں۔ شبانہ نے آہستگی سے کہا۔

" چلو چھوڑو، میں سوچ رہی ہوں کل بازار سے نئی چادریں لے آؤں۔ یہ پرانی ہو گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو۔" اس نے سوچا۔ وہ لمحے بھی تو تھے جب سب نیا تھا۔ شبانہ کی ہنسی، خوابوں کی باتیں، مستقبل

کے منصوبے۔ مگر خواب جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں - شاید خوشیاں سب سے ناپائیدار چیز ہیں۔

کھانے کے دوران اکثر یہی گفتگو ہوتی، چادریں، برتن، یا کبھی بجلی کا بل۔ کوئی قہقہہ نہیں، کوئی کہانی نہیں۔ صرف ضرورتیں اور چھوٹے چھوٹے فیصلے۔ نہ باہر کھانے جاتے، نہ کسی تقریب میں جاتے۔ زندگی ایک بند دائرہ تھی۔ گھر اور دفتر، دفتر اور گھر۔ اکثر وہ دونوں ساتھ بیٹھتے بھی تو یوں لگتا جیسے دو اجنبی بس ایک ہی چھت کے نیچے وقت کاٹ رہے ہوں۔ پنکھا اپنی یکساں آواز میں چل رہا تھا، جیسے دونوں کی باتوں کی تائید کر رہا ہو۔ کمرے میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔ صرف پنکھے کی گھر گھر اور برتنوں کی کھنک باقی رہ گئی۔

اگلے دن دفتر میں، جب گھڑی نے دس بجائے اور کولیگ اپنی اپنی میزوں پر موجود تھے، ذیشان نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر وہ نیلا دائرہ دیکھا جو نئے میسج کی خبر دے رہا تھا۔ وہی لڑکی تھی، شبو۔ وہی ماڈرن لڑکی، شوخ لہجہ، موسیقی کی باتیں، فلموں کا ذکر، اور ایک زندگی جو ذیشان کے روزمرہ سے بالکل الٹ تھی۔ دفتر کی روایتی خاموشی اور کاغذوں کی سرسراہٹ کے بیچ، ذیشان کی انگلیاں میسنجر کے کی بورڈ پر دوڑنے لگتیں۔ دس گیارہ بجے کے بعد یہ چیٹنگ شروع ہوتی اور گاہے گاہے چلتی رہتی۔ کبھی وہ شبو کی باتوں پر مسکرا دیتا اور کولیگ حیران ہو کر اسے دیکھتے کہ یہ سنجیدہ سا آدمی کس خیال میں کھو گیا ہے۔

لیکن گھر میں وہی سرد رویہ تھا۔ شبانہ کے سامنے ذیشان خاموش اور تھکا ہوا لگتا۔ جیسے دن کا سارا بوجھ اسے چپ کرا دیتا ہو۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اس کا اصل دن، اس کی اصل زندگی، تو تب شروع ہوتی جب میسنجر کی اسکرین پر شبو کی ہنستی ہوئی لائن ابھرتی۔

”شانی، آج کون سا نغمہ سن رہے ہو؟“ ذیشان اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا۔ دفتر کا وقت، فائلوں کی دنیا، سب دھندلا پڑ جاتا۔

”شبو، آپ کی آواز کیسی ہے؟ مجھے لگتا ہے آپ کی باتوں میں کوئی گہری اداسی ہے۔“

”شانی، میں آپ سے ابھی بات نہیں کروں گی، جب ہم ملیں گے پھر ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔“ اسکرین پر ٹائپنگ کا نشان ابھرتا اور غائب ہو جاتا۔ ذیشان کو لگا جیسے کوئی دور بیٹھا اس کے دل کی گرہیں کھول رہا ہے۔

اگلی صبح شبانہ حسب معمول ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ انڈے تلتے وقت فرائنگ پین سے نکلنے والی خوشبو کچن میں گھل گئی تھی۔ میز پر پراٹھے، ایک پیالے میں اچار، اور چائے کے دو کپ تھے۔

”چائے میں دودھ کم ڈالنا تھا، کل ہی کہا تھا نا۔“ ذیشان نے کپ منہ سے ہٹا کر کہا۔

شبانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کل ہی تو تم نے

کہا تھا کہ زیادہ دودھ ڈالو۔ تمھاری پسند بدلتی رہتی ہے۔؟“

ذیشان چپ ہو گیا۔ دونوں نے ناشتہ مکمل خاموشی میں کیا۔ کھڑکی سے آنے والی دھوپ بھی یوں لگ رہی تھی جیسے بیزاری کے رنگ اختیار کر چکی ہو۔ ذیشان نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”کتنی عجیب بات ہے، ایک ہی مکان، ایک ہی وقت، ایک ہی آدمی اور عورت، مگر ان کے بیچ کوئی کہانی جنم نہیں لیتی۔ جیسے ایک ایسی کتاب ہو جس کے سارے صفحے سفید ہوں۔“

رات کو شبانہ سو گئی۔ کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ذیشان کھڑکی کے قریب کھڑا باہر کی خالی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ کہیں کہیں اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی سڑک کو یوں دکھا رہی تھی جیسے اداسی کے رنگ بکھرے ہوں۔ وہ پلٹا، اور بستر پر لیٹ کر موبائل کھولا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تصویروں کی دنیا کھل گئی۔ لوگوں کے سفر، خوش چہرے، سمندر کنارے بنائی گئی سیلفیاں اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

دفتر میں دوپہر کا وقت تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کھانوں کے ڈبے کھولے ہوئے تھے۔ شور کے بیچ بھی ذیشان کی میز پر خاموشی بسی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے لنچ رکھا تھا مگر اُس نے اسے چھوا تک نہ تھا۔ وہ محض لیپ ٹاپ کی سکرین پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا، جیسے پوری دنیا اس چھوٹی سی اسکرین میں قید ہو۔ شبو نے لکھا تھا۔

”شانی، کیا کبھی تم نے چاہا ہے کہ سب پردے ہٹ جائیں؟ کہ ہم اپنی اصل صورت میں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں؟“

ذیشان کی آنکھوں کے آگے ایک منظر ابھرا۔ کسی سنسان سڑک پر برف باری ہو رہی ہے، سفید دھند کے پیچھے ایک عورت کی پرچھائیں دکھائی دے رہی ہے۔ اور اس پرچھائیں کے اندر ایک ایسی روشنی جل رہی ہے جو برف کو پگھلا سکتی ہے۔ اس نے بے اختیار لکھ دیا۔

”شبو، میں چاہتا ہوں کہ وہ لمحہ آ جائے جب برف ٹوٹ جائے اور ہم اس آگ کو بے نقاب دیکھ سکیں۔“

اسکرین پر اب کچھ دیر خاموشی رہی۔ ذیشان نے دل تھام کر انتظار کیا۔ پھر آخر کار جواب ابھرا۔

”شانی، تمھیں کبھی لگا کہ اصل زندگی وہ نہیں جو ہم جیتے ہیں بل کہ وہ ہے جو ہم چھپاتے ہیں؟“

ذیشان کے ہونٹ خشک ہونے لگے پھر اس نے ٹائپ کیا۔

”ہاں، شاید ہم سب اپنے چہروں پر برف اوڑھے پھرتے ہیں۔ اور اندر کہیں کوئی آگ جلتی رہتی ہے جسے دکھانے سے ڈرتے ہیں۔“

کچھ لمحوں تک شبو کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ ذیشان کی آنکھیں بار بار اسکرین پر ٹھہرتی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے دفتر

رک گیا ہو اور صرف ایک خاموشی اسے گھیرے بیٹھی ہو۔ پھر ایک پیغام ابھرا۔
”شانی، میں تمہاری اس آگ کو محسوس کر سکتی ہوں، شاید اس لیے کہ میرے اندر بھی وہی آگ ہے۔“ ذیشان نے ایک گہری سانس لی اور لکھا۔
”بس کچھ دن اور پھر ہم سب ان دیکھی زنجیریں توڑ دیں گے۔“ شبو کا جواب آیا۔
”کبھی سوچا ہے کہ اگر ہم آزاد ہوتے تو کہاں جاتے؟“
”سمندر کے کنارے۔ میں گٹار بجاتا، تم ہنستے ہوئے میرے آس پاس رقص کرتیں۔ کبھی سوچا ہے ہم ایک دن لائیو شو دیکھنے جائیں؟ لائٹس، میوزک، بھیڑ۔۔ جیسے سب کچھ اپنی قید سے باہر نکل آئے۔“ شبو نے لکھا۔
”ہاں، اور کوئی نہ پوچھے کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں۔ صرف ہم۔۔ اور ہماری دھن۔ وہ لمحہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت لمحہ ہوگا۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں اپنی اصل صرف وہاں پاسکوں گی جہاں شور ہو، ڈانس ہو، اور کسی کو پرواہ نہ ہو کہ میں کون ہوں۔“
ذیشان نے آنکھیں موند لیں۔ وہ شبو کے الفاظ کو دیکھ نہیں رہا تھا، سن رہا تھا۔ جیسے وہ سامنے بیٹھی ہو۔ پھر اس نے لکھا۔
”تم جانتی ہو، تمہاری یہ باتیں مجھے پاگل کر دیتی ہے۔ تم میرے لیے وہ نغمہ ہو جو میں نے کبھی نہیں سنا مگر دل اسے پہچانتا ہے۔“
ذیشان نے یہ جملہ بھیجا اور خود چونک گیا۔ یہ میں نے کیا لکھ دیا؟ میں تو کبھی شاعری کرنے والا نہیں تھا، یا شاید یہ بھی میری کوئی اور صورت ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی بیش قیمت موتی مل گیا ہے۔
اب شبانہ اسے زہر لگنے لگی تھی۔ وہ جلد از جلد اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف شبانہ بھی اس سے حد درجہ بیزار ہو چکی تھی۔ ذیشان کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ جلد ہی طلاق کا مطالبہ کرنے والی ہے۔ ذیشان نے بالآخر ملاقات کا وقت طے کر لیا۔ اس نے میسیج بھیجا۔
”شبو کل شام ہم ملیں گے، ایک ریسٹورنٹ ہے شہر کے بیچوں بیچ۔ وہاں سب بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔ ہم وہیں پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔“
چند لمحوں بعد اسکرین پر جواب جگمگا اٹھا۔
”شانی، میرا دل بہت تیز دھڑک رہا ہے۔ کاش میں ابھی تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔“
ریسٹورنٹ کا ہال نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کونے میں مدھم دھن بج رہی تھی۔ زرد روشنی میزوں پر جھک رہی تھی اور لوگوں کی دھیمی سرگوشیاں فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ ذیشان نے دروازہ دھکیلا تو ایک لمحے کو اس کا دل ایسے دھڑکا جیسے سینے کی ہڈیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔
”شبو۔“ اس نے خود سے سرگوشی کی۔ ”آج آخر کار میں تمہیں دیکھنے جا رہا ہوں۔“

اس نے کونے والی میز ریزرو کروائی تھی اور وہاں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ ”اوہ۔۔۔ شبو مجھ سے پہلے آ چکی ہے۔“ اس نے زیرِ لب کہا۔ لڑکی کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس کے بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ ایک ایک قدم چلتا ہوا آگے بڑھا، پھر قریب جا کر دھیرے سے کہا، ”ہائے شبو!“

لڑکی نے گردن موڑی، اور ذیشان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ سانس جیسے کسی نے روک دی ہو۔

وہ شبو نہیں تھی۔ وہ شبانہ تھی۔

کپکپاتے ہوئے قدم جیسے زمین میں دھنس گئے۔ میز پر رکھی موم بتی کی لو اس کے چہرے پر لرزنے لگی۔ چند ثانیوں تک دونوں خاموش رہے۔ صرف سانسوں کی آواز تھی، اور ایک لرزتی ہوئی حقیقت جو دونوں کے چہروں پر پھیل رہی تھی۔ پہلے شبانہ بولی۔ آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ ”تو۔۔۔ تم۔۔۔ شانی ہو؟“

ذیشان نے کچھ کہنا چاہا، مگر الفاظ حلق میں پھنس گئے۔ اس کے ہونٹوں سے بمشکل نکلا۔

”اور تم شبو؟“

ذیشان کی آنکھوں میں ایسی ویرانی تھی جیسے ابھی ابھی کوئی جنازہ اٹھا ہو۔ وہ جانتا تھا، یہ جنازہ شبو کا تھا۔ وہ شبو، جو کبھی تھی ہی نہیں، آج شبانہ کی آنکھوں میں دفن ہو گئی اور شبانہ نے بھی دل ہی دل میں محسوس کیا کہ اس لمحے شانی بچھڑ گیا ہے۔ دونوں کے دلوں میں ایک ساتھ خنجر اترا۔ اس لمحے وہ جان گئے کہ یہ تعلق مزید آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو محبت انھوں نے خفیہ ناموں میں محسوس کی تھی، وہ دراصل اپنے ہی شریکِ حیات کے ساتھ بے وفائی تھی۔ اور بے وفائی کا بوجھ محبت سے کہیں زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

”تم مجھ سے نہیں۔۔۔ شبو سے محبت کرتے ہو۔ اور شبو تو میں کبھی تھی ہی نہیں۔“ شبانہ نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”ذیشان، تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میرا شوہر بن کر خود کو صالح دکھاتے رہے، اور شانی بن کر میرے دل کو لوٹتے رہے۔ میں نے تمھیں اپنا مانا اور تم نے مجھ سے بے وفائی کی۔“

ذیشان کے چہرے پر زرد روشنی نے ایک سایہ ڈال دیا۔ وہ آہستگی سے بولا۔

”اور میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ شبانہ نیک پروین ہے، میری سخت گیر شریکِ حیات۔ مگر دراصل وہ شبو تھی، جو خوابوں میں گٹار بجاتی تھی، رقص کرتی تھی۔ مجھے دھوکہ تو تم نے بھی دیا۔“

میز پر رکھی موم بتی بجھ گئی۔ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک ہی سمت جا سکتے تھے مگر قدم الٹی سمتوں میں اُٹھے۔

اس رات ریسٹورنٹ کی روشنیوں میں دو لوگ نہیں بچھڑے، بلکہ شانی اور شبو مر گئے، اور شبانہ اور ذیشان اپنی اپنی تنہائی میں ہمیشہ کے لیے قید ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

محبت کے لمحوں کی دھند

شام کا وقت تھا۔

پارک کے درختوں پر سنہری دھوپ آخری بار چمک رہی تھی۔

ہوا میں پتے جھول رہے تھے اور کہیں دور بچوں کی قلقاریاں ماند پڑتی جا رہی تھیں۔

علی شہریار ایک بینچ پر بیٹھا موبائل فون کے بڈز کانوں میں لگائے، غزل سن رہا تھا—

''تم ہی ہو، اب تم ہی ہو...''

اس کے چہرے پر ایک عجب سکون تھا، مگر آنکھوں کے پیچھے کوئی خالی پن چھپا ہوا تھا۔

اسی لمحے نازنین آئی—

پھول دار دوپٹہ ہوا میں ہلکا سا اُڑتا ہوا،

قدم جیسے کسی فیصلے کے بوجھ سے بھاری۔

اس نے آہستہ سے علی کے سامنے آ کر کہا—

نازنین (نرمی سے):

''کتنے بدل گئے ہو، علی... پہلے تو میری آہٹ پر مسکرا دیتے تھے۔''

علی نے ایک بڈ کان سے نکالا، مسکرا کر بولا—

علی:

''زندگی بدل گئی ہے نازنین، مسکرانے کی عادت نہیں رہی۔''

نازنین:

''زندگی نہیں، تم بدل گئے ہو۔''

علی (ہنسی دباتے ہوئے)

''شاید۔ پر تم تو ویسی ہی لگتی ہو— جذباتی، شاعرانہ، اور تھوڑی ضدی۔''

نازنین نے نظریں جھکائیں۔

ہونٹ کپکپائے، جیسے دل کا بوجھ لفظوں سے پہلے باہر نکلنا چاہتا ہو۔

نازنین (آہستہ سے)

''اگر میں کہوں کہ میری زندگی ایک ایسے موڑ پر ہے جہاں میں اکیلی نہیں رہی، تو تم کیا کہو گے؟''

عامر عباس ناصر اعوان

علی (غافل انداز میں)

''اچھا؟ مطلب کوئی نیا دوست، یا... کوئی نیا خواب؟''

نازنین:

''نہیں، علی۔ ایک نئی زندگی۔''

علی (ابھی بھی لاپرواہ لہجے میں)

''واہ، بڑا فلسفیانہ جواب دیا ہے۔ لگتا ہے آج تم کسی کہانی کے موڈ میں ہو۔''

نازنین کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

اس نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا—

نازنین:

''میں تمہیں کہانی نہیں سنا رہی، علی... حقیقت بتا رہی ہوں۔ میں ماں بننے والی ہوں۔''

فضا ایک دم خاموش ہو گئی۔

درختوں کی شاخوں سے ہلکی سی سرسراہٹ اٹھی۔

علی نے بے اختیار بڈ دوبارہ کان میں لگا لیا،

جیسے وہ یہ بات سننا ہی نہ چاہتا ہو۔

علی (گھبراہٹ سے ہنستے ہوئے)

''نازنین... تم مذاق کر رہی ہو نا؟''

نازنین (درد سے)

''کاش یہ مذاق ہوتا۔''

یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ مڑ گئی۔

قدم بھاری، آنکھوں میں نمی، سانس جیسے رک رک کر چل رہی تھی۔

پارک کے کونے میں ایک چھوٹی سی کینٹین تھی۔

نازنین وہاں جا کر رکی۔

چہرے پر نمی، دل میں اداسی۔

اس نے خود سے بے خیالی میں سگریٹ نکالی، سلگائی، اور پہلا کش لیا۔

دھوئیں کا بادل آسمان میں گھل گیا—

وہ بادل جو شاید اس کے اندر کے درد کا عکس تھا۔

دوسری طرف علی شہریار ابھی بھی بینچ پر بیٹھا تھا۔

اس نے موبائل میں گانے بدلتے ہوئے اگلا ٹریک لگایا—

''تو ہے کہ نہیں...''

ہلکی موسیقی کے ساتھ اس نے ایک سگریٹ جلائی۔

دھوئیں کے مرغولے ہوا میں مڑتے چلے گئے،

مگر دل میں پچھتاوے کا بوجھ ابھرنے لگا۔

چند لمحے بعد وہ بے قراری سے اٹھا،

اور نازنین کے پیچھے چل دیا۔

قدموں کی چاپ میں ندامت تھی، دل میں خوف، اور آنکھوں میں پچھتاوا۔

کینٹین پر پہنچ کر وہ رکا۔

نازنین اب بھی میز پر کہنی ٹکائے بیٹھی تھی،

اور اس کی انگلیوں میں جلتی سگریٹ آہستہ آہستہ راکھ بن رہی تھی۔

علی نے چند لمحے اسے دیکھا۔

ہونقوں کی طرح، جیسے پہلی بار اسے دیکھ رہا
ہو —
وہی چہرہ، مگر اب دکھ کے رنگ میں لپٹا ہوا۔
نازنین نے نگاہ اٹھائی،
علی کو دیکھا، پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔
نازنین (دھیرے سے)
"یہ دھواں... بالکل تمھاری طرح ہے، علی۔
کبھی گرم، کبھی ٹھنڈا... مگر آخرکار، بس
راکھ چھوڑ جاتا ہے۔"
علی خاموش کھڑا رہا۔
ہاتھ کانپ رہے تھے۔
بڑ زاب بھی اس کے کانوں میں تھے، مگر
موسیقی بند ہو چکی تھی۔
علی (بھرائی ہوئی آواز میں)
"نازنین... میں غلط تھا۔ میں نے تمھیں
نہیں سمجھا۔ میں تمھیں سن ہی نہیں پایا۔"
نازنین (نم لہجے میں)
"محبت سنی نہیں جاتی، علی — محسوس کی
جاتی ہے۔
اور تم نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔"
علی نے دھیرے سے قدم بڑھایا۔
آنکھوں میں نمی تھی، آواز لرز رہی تھی۔
علی:
"اب محسوس کر رہا ہوں۔
تمھاری خاموشی، تمھارے آنسو، اور وہ
زندگی...
جو میری غفلت سے پہلے ہی مجھ سے جڑ چکی
تھی۔"
نازنین کے ہونٹ تھرتھرائے،
وہ پلٹنے لگی، مگر علی نے نرمی سے اس کا ہاتھ
تھام لیا۔
علی:
"ایک موقع اور دے دو نازنین۔
میں وہ دھواں بھی بجھا دوں گا جو تمھاری
آنکھوں میں ہے۔
بس تم پھر سے میرا یقین بن جاؤ۔"
نازنین نے آنکھیں بند کیں، ایک آنسو بہہ
نکلا —
اور وہ آہستہ سے بولی:
نازنین:
"میں لوٹ آئی ہوں، علی... کیونکہ شاید تم
واقعی بدل گئے ہو۔
اور محبت کو بس یہی چاہیے — احساس۔"
علی نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر لب رکھے۔
ہوا نرم ہو گئی۔
ایش ٹرے میں بجھی سگریٹ کی راکھ اڑ کر
آسمان کی طرف جا چکی تھی۔
اور ان دونوں کے درمیان جو دھواں تھا —
وہ اب صرف روشنی میں بدل گیا۔

☆☆☆☆☆

”شکر کی چھاؤں“

[اختتامیہ حصہ]

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے...... اپنی اداسی میں کسی کی ناک توڑ دو۔“

ارحم بڑبڑایا:

اور دوبارہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا، مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر باقی رہ گیا تھا۔

ارحم کی مدد سے جلد ہی رحیم کی جاب لگ گئی تھی اس نے سب سے پہلے رحیمہ کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے لیے کہا تھا۔

داخلے جاری تھے اور اسے اپنے من پسند مضمون میں بہت آسانی سے داخلہ مل گیا تھا۔ افشین نے اس کی بہت مدد کی تھی وہ دل سے اس کی مشکور تھی۔

شروع میں سب ٹھیک تھا۔ کلاس میں کچھ فیلوز سے اس کی بات چیت تھی لیکن دوستی اب بھی کسی سے نہیں ہو سکی تھی۔ نا جانے کیسے چند آوارہ صفت اوباش لڑکوں کی نظر اس اکیلی آتی جاتی لڑکی پر پڑ گئی تھی۔ ابو اپنا کام نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اس لیے اسے رائیڈ پر آنا جانا پڑتا تھا۔

پہلے پہل تو بس بات دیکھنے کی حد تک تھی لیکن کچھ دنوں سے ان لڑکوں نے بائیک پر اس کے پیچھے آنا شروع کر دیا تھا۔

وہ خوفزدہ تھی، بہت خوفزدہ۔

اسی خوف کے زیر اثر اس نے یونیورسٹی جانا بند کر دیا تھا۔

کیسی ہو؟ امی بتا رہی تھی یونیورسٹی نہیں جا رہی خیریت؟

رحیم نے اس کے فون اٹھاتے ہی سوال پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

وہ۔۔۔ وہ

میری طبیعت خراب تھی نا اس لیے۔

اس نے اٹک اٹک کر بات مکمل کی تو رحیم خاموش ہو گیا۔

وہ آواز سے ہی پریشان لگ رہی تھی۔

وہ جانتا تھا یونیورسٹی میں سو مسئلے ہو جاتے ہیں۔ لڑائیاں ہو جاتی ہیں۔

تم جانتی ہو نا تم مجھ سے ہر بات شیئر کر سکتی ہو رحیمہ۔

اب کی بار اس نے سنجیدگی سے کہا۔

کمرے میں داخل ہوتے ارحم نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

صفورا پرویز

رحیم پریشان لگتا تھا۔

میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کوئی بات نہیں ہے۔

وہ لہجہ مضبوط بنائے بولی لیکن افسردگی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

رحیم نے لب بھینچے اور فون بند کر دیا۔

رحیمہ کا دل یک دم بھر آیا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو ہانڈی بناتی امی بھاگ کر اس کے پاس آئیں۔

رحیمہ، میرے بچے کیا ہوا؟

رحیم، امی مجھے رحیم یاد آ رہا ہے۔

وہ ہچکیاں لیتے بولی تو امی کا دل پسیجا۔

میری جان بات تو کر رہی تھی بھائی سے۔

اس نے فون کاٹ دیا۔

اس نے میرا فون کاٹ دیا۔

وہ ایک بات کا غم دوسری بات پر منا رہی تھی۔

میں ابھی فون کر کے کلاس لیتی ہوں اسکی کیوں کاٹا میری بیٹی کا فون۔

امی نے اس کے آنسو صاف کرتے پچکارا اس سے پہلے امی رحیم کو فون ملاتیں۔ رحیمہ کا سر ان کے شانے پر آن پڑا۔

امی کو ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

رحیمہ، رحیمہ، ان کا لہجہ رندھ گیا۔ نذیر کو فون ملایا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ ہسپتال میں تھے۔

بشیر چچا بھی نذیر کے ساتھ کھڑے تھے۔

رحیمہ کو ڈرپ لگی تھی وہ اس کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

کس بات کا سٹریس لیا ہے بچی نے؟

بشیر نے پریشان ہوتے نذیر سے پوچھا تو وہ بے بسی سے نفی میں سر ہلا کر رہ گئے۔

معلوم نہیں بشیر، کچھ پوچھو تو کہتی ہے پڑھائی کو لے کر پریشان ہے اور کچھ نہیں۔

اس سے پہلے بشیر کچھ کہتے ارحم کی کال آنے لگی۔

میں گھر جا کر کال کرتا ہوں ارحم ابھی ہسپتال ہوں بھائی کے ساتھ۔

ارحم نے ایک نظر لیپ ٹاپ پر کام کرتے رحیم کو دیکھا۔

خیریت؟

رحیمہ کی طبیعت خراب ہے بیٹے نا جانے کس بات کا سٹریس لیا ہے بچی نے۔

رحیمہ؟

ارحم کے نام لینے پر رحیم نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

پر ابھی تو کچھ دیر پہلے وہ رحیم سے بات کر رہی تھی۔

رحیم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دل یک دم کسی مشین میں دبتا محسوس ہوا۔

کیا ہوا رحیمہ کو۔ کہاں ہے وہ؟

رحیم نے ارحم کے پاس آتے بے چینی سے

پوچھا ساتھ ہی جیب سے فون نکالتے نذیر کو کال ملائی۔

ارحم نے فون کاٹ کر رحیم کے ہاتھ سے فون لیا۔

گھر جا کر کال کرلیں گے وہ تمھیں۔ پریشان نہیں ہو وہ ٹھیک ہے اب۔

ارحم نے اس کا شانہ پکڑتے اسے تسلی دی لیکن اسے کسی طور چین نہیں آیا۔

میں نے اسے ناراض ہو کر فون کاٹ دیا تھا ارحم۔

وہ ہرٹ ہوئی ہوگی۔

وہ یک دم سے بہت افسردہ نظر آنے لگا تھا۔

ایک تو میں تم دو ایموشنل بہن بھائیوں سے بہت بیزار ہوں۔

وہ حقیقتاً بیزار نظر آتا تھا۔

ہٹو تم یہاں سے۔

رحیم نے خفا ہوتے اس کا ہاتھ جھٹکا تو وہ ہنس دیا۔

اچھا میں افشین سے کہوں گا وہ رحیمہ سے بات کرے۔

اکثر باتیں بہنیں بھائیوں سے کرتے ہچکچاتی ہیں۔

ارحم کے کہنے پر رحیم نے ایک خفا نظر اس پر ڈالی۔

میری بہن مجھ سے ہر بات کرتی ہے۔ ہر بات -- وہ اپنے الفاظ پر زور دیتے بولا۔

ارحم نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔

لیکن اب تم یہاں ہو دوسرے ملک۔ تم جانتے ہو وہ ایموشنل فول تمھیں ٹینشن نہ دینے کے لیے کچھ چھپا رہی ہے۔

وہ ایموشنل فول نہیں ہے۔ بس حساس ہے۔

رحیم خفا ہو کر بولا تو ارحم نے آنکھیں گھمائیں۔

وٹ ایور۔

تم بات کرو پھر افشی سے۔

افشین نام ہے میری بہن کا افشین۔

ارحم نے اس کے افشی کہنے پر آنکھیں چھوٹی کرتے اسے گھورا۔

تم میری بہن کو ایموشنل فول کہو اور میں افشین کو افشی نہیں کہہ سکتا۔

رحیم کے تلووں پر لگی اور سر پر بجھی۔

ارحم نے کلس کر اسے دیکھا۔

اب وہ افشی کو میسج کر رہا تھا۔

افشین اگلے روز ہی رحیمہ سے ملنے آئی تھی۔ اتنے دنوں کا غبار اپنے اندر دباتے وہ افشین کے بار بار اصرار کرنے پر دبا نہیں پائی اور ساری بات اس کے گوش گزار کی۔

میں رحیم یا ابو، امی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہچکیاں بھرتے اپنی الجھن بتا رہی تھی۔ امی نے دم سادھے اس کی باتیں سنیں اور اسے یونیورسٹی نا بھیجنے کی قسم کھا لی۔

افشین نے ان کے فیصلے پر حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا۔ سے رحیمہ پر بے حد غصہ تھا، وہ اس سے بات کر سکتی تھی۔

اسے کچھ لڑکے تنگ کرتے ہیں۔

ارحم اور رحیم نے دم سادھے افشی کی بات سنی۔

کون لڑکے، کیسا تنگ۔

پہلا سوال ارحم کی طرف سے آیا تھا۔

رحیم تو جیسے سکتے میں چلا گیا تھا۔

معلوم نہیں یونیورسٹی کے باہر ہوتے ہیں۔

ایسی مخلوق تو ہر کونے میں پائی جاتی ہے ارحم، رحیمہ زیادہ ڈر گئی ہے۔ پر یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ اب تائی امی اس کی پڑھائی ہی رکوا دیں۔

افشی بگڑ کر بولی۔

رحیم کو اس کی آخری بات پر ہوش آیا۔

کیا مطلب پڑھائی رکوا دیں۔؟

وہ شاک لگتا تھا۔

تائی امی کہہ رہی تھیں وہ اب رحیمہ کو یونیورسٹی نہیں بھیجیں گی۔

افشی ناگواری سے بول رہی تھی اسے تائی امی کا فیصلہ ذرا پسند نہیں آیا تھا۔

موبائل میں افشی کی ناگواری شکل دیکھتے رحیم نے اپنا فون اٹھایا۔

ارحم نے اس کا ارادہ جانچتے افشی کو فون رکھنے کا کہا۔

رحیم رحیمہ کو کال ملا رہا تھا۔

دوسری طرف رحیمہ کو افشی کا معذرت نامہ مل چکا تھا۔

اب وہ رحیم کی کال اٹھاتے ہچکچا رہی تھی۔

پر یہ کال وہ بند نہیں کر سکتی تھی۔

رابطہ جڑا تو وہ شرمندہ سی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

تم اتنی کمزور تو نہیں تھی رحیمہ۔ رحیم نے اداسی سے کہا۔

وہ خفا تھا۔

میں ڈر گئی تھی۔ وہ چار لوگ تھے۔

بتاتے ہوئے اس کی آواز رندھی تو رحیم کے دل کو ہاتھ پڑا۔

ارحم کا دل کسی نے مٹھی میں دبوچا۔ وہ کس قدر ذہنی اذیت کا شکار تھی۔

ویڈیو کال پر اس کا زرد چہرہ دیکھتے اسے حقیقتاً کچھ ہو رہا تھا۔ دل کر رہا تھا اس کو اذیت دینے والوں کو دوہری اذیت دے۔

تم کل یونیورسٹی جاؤ گی رحیمہ۔

ارحم نے رحیم کے پاس بیٹھتے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

امی، ابو اور رحیم نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔

لیکن بیٹے۔

تائی امی پریشان نظر آتی تھی۔

فکر نہیں کریں تائی امی میرا دوست ہے وہ ان سب کو اندر کروا دے گا جنھوں نے رحیمہ کو اتنی اذیت دی ہے۔

گھٹ گھٹ کر وکٹمز کو نہیں ولنز کو بیٹھنا چاہیے۔

ہمارے چھپ کر خاموشی سے بیٹھ جانے والے فیصلے ہی ایسے لوگوں کو شے دیتے ہیں۔

ہمیں اپنی لڑکیوں کو ڈرنے کے بجائے لڑنا سکھانا چاہیے۔ تم لڑو گی نا رحیمہ؟

اس نے بات کے آخر میں رحیمہ کو مخاطب کیا تو وہ کنفیوز ہو گئی۔

اس نے رحیم کو دیکھا۔

رحیم نے مسکرا کر پلکیں جھپکیں۔ وہ اسے مثبت جواب دینے کا کہہ رہا تھا۔

رحیمہ نے اسی انداز میں ارحم کو مثبت جواب دیا۔

راحم اور رحیم اس کے انداز پہ مسکرائے۔

ابو نے اس کا سر تھپکا۔

امی اب بھی پریشان تھیں پر راحم اور رحیم کا اطمینان نے انہیں کچھ پرسکون کر دیا تھا۔

اگلے روز جب رحیمہ اپنی یونیورسٹی سے نکل کر گھر کو روانہ ہوئی تو حسب معمول وہی آوارہ صفت اوباش لڑکے اُس کے تعاقب میں آ گئے۔

رحیمہ کا دل لرزنے لگا، قدم بے اختیار تیز ہونے لگے۔

اس سے پہلے ان میں سے ایک اس کا راستہ روکتا عین اسی دم سادہ لباس میں گشت کرتے پولیس اہلکاروں نے اُن لڑکوں کو وہیں دبوچ لیا۔

آس پاس کے لوگوں نے پولیس والوں کو داد دینا شروع کی۔

رحیمہ نے تشکر سے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ سجدے میں گر جانا چاہتی تھی۔

اپنا آپ بہت ہلکا لگنے لگا تھا۔۔۔ اللہ کے بعد وہ ارحم اور رحیم کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔

گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے اس نے رحیم کو کال ملائی تھی۔ ارحم اور رحیم نے آج خاص طور پر چھٹی کی تھی۔

میں بہت، بہت سے زیادہ اچھا محسوس کر رہی ہوں رحیم۔

میں بہت خوش ہوں۔

اس کا چہرہ خوشی سے گلابی پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔

رحیم خوش ہونے کے ساتھ کچھ افسردہ سا بھی ہو رہا تھا۔۔ اس کی بہن کس قدر اذیت میں تھی اور وہ اس سب سے انجان تھا۔

رحیمہ۔

اس کے بات مکمل کرنے پر رحیم نے اسے پکارا تو سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

تم آئندہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی۔

او کے۔؟

وہ بہت نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا، التجا کر رہا تھا۔ آنکھوں میں نرمی کے ساتھ نمی بھی تھی۔

ام ہم۔۔ رحیمہ نے نم لہجے میں کہتے اثبات میں سر ہلایا۔

ارحم نے ان کا ایموشنل ڈرامہ دیکھتے آنکھیں گھمائیں۔

امی، ابو نے رحیمہ کا سر تھپتھپایا تو وہ مسکرائی۔

پھر ارحم کی طرف نگاہ اٹھائی۔

وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رحیمہ کا دل زور سے دھڑک کر ست پڑا۔

پھر ہمت جمع کرتے اس نے پہلے رحیم کو دیکھا۔

پھر ارحم سے نظریں ملائیں۔

وہ اس کی ہر حرکت بے اختیاری میں بہت محو ہو کر دیکھ رہا تھا۔

میں تمھاری بھی بہت شکر گزار ہوں، ارحم۔

اس نے نظریں ملا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ پہلی بار اپنی مرضی سے نظریں ملائے اس سے بات کر رہی تھی۔ اس کا نام لے رہی تھی۔

اس بار ارحم کے دل کی دھڑکن ست پڑی۔

اس نے سر ہلا کر شکریہ وصول کیا۔ اپنی کیفیت سے پریشان رحیم کی طرف نگاہ اٹھائی۔

وہ بھی اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

ارحم کا وہاں بیٹھنا محال ہوا۔

وہ ان سب سے معذرت کرتے اپنا فون لیے کمرے سے نکل گیا۔

وہ صرف تشکر کی نگاہ تھی جو رحیمہ نے ارحم کی طرف اٹھائی تھی۔

پر ارحم کی نگاہ بدل گئی تھی۔ اس کا دل بدل گیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت سے پریشان ہو گیا تھا۔

تم کیسے ہو ارحم؟

رحیم بتا رہا تھا تمھاری طبیعت خراب ہے؟

رحیم سے ویڈیو کال کرتے ہوئے رحیمہ کو ارحم نظر آیا تو اس نے ارحم سے خیریت دریافت کی۔

ارحم کی طبیعت پل میں بحال ہونے لگی۔

اس نے رحیم سے فون پکڑا اور اپنے بیڈ پر آ بیٹھا۔

میں ٹھیک ہوں، بس تمھارے بھائی کی کوکنگ نے میرے ناک اور سر میں درد کر رکھا ہے۔

ارحم جل کر بولا۔

رحیم نے نفی میں سر ہلاتے اس ناشکرے کو دیکھا۔

شاید آپ پیٹ کہنا چاہ رہے ہیں۔

رحیمہ کی شرارت بھری آواز پر رحیم کا قہقہہ گونجا۔

ارحم نے جل کر رحیم کو دیکھا۔

یقیناً اس نے اس کے پیٹ خراب ہونے کی
خبر رحیمہ تک پہنچا دی تھی۔
اس کے کان سرخ پڑے۔
رحیمہ نے اس کی کیفیت دیکھتے فون امی
کو پکڑا دیا۔
امی اب اسے کسی قہوے کی ترکیب بتا
رہی تھی۔

تمہیں پتا ہے رحیم فہد ہر کام میں بہت تیز
ہے۔ اس نے میری اسائمنٹ بنانے میں
بھی بہت مدد کی ہے۔
ارحم سمیت تمام گھر والوں کو فہد نامہ سنتے
آج تیسرا دن تھا۔
وہ اس کا سینئر تھا جس نے ایک اسائمنٹ
بنانے میں اس کی مدد کی تھی اور رحیمہ اس کی
اتنی سی مہربانی پر اس کی بہت مشکور تھی۔
کم آن رحیمہ تھوڑا سا گائیڈ ہی تو کیا تھا اس
لڑکے نے۔۔۔
ارحم جل کر بولا۔
رحیمہ نے منہ بنایا۔
ہاں تو کوئی میرے لیے اتنا بھی نہیں کر
رہا تھا۔
تو تم مجھے بول دیتی۔
رحیم اور رحیمہ نے ایک ساتھ اس کی
طرف دیکھا۔
ارحم گڑبڑایا۔
میرا مطلب تھا تم رحیم یا مجھ سے مدد لے لیتی
تو ہمیں فہد نامہ نا سننا پڑتا۔۔
سیب کاٹتے ہوئے امی ارحم کی بات پر
مسکرائی۔
رحیم نے اس کے کندھے پر ہنستے ہوئے
ہاتھ مارا۔
رحیمہ نے منہ بناتے فون کمرے سے باہر
آتے ابو کو تھمایا اور کتابیں لیتی چھت پر
چلی گئی۔
ارحم اس کی ناراضگی دیکھتے لب بھینچ گیا۔۔ وہ
سب کے سامنے اسے آواز نہیں لگا سکتا تھا۔

اس کے دل کی کیفیت عجیب تھی لیکن وہ
اپنے جذبات سے ناواقف نہیں تھا۔
وہ جانتا تھا اسے رحیمہ سے محبت ہونے لگی ہے۔
اس سے دو منٹ کی گئی بات پر وہ دو دن مسکرا
سکتا تھا۔
لیکن وہ اس سے روز بات کرنا چاہتا تھا۔
اور یہ خواہش بغیر کسی بندھن کے پوری نہیں
ہو سکتی تھی۔
نا۔ وہ رحیمہ کو براہ راست بتانا چاہتا تھا، نا
رحیم کا مان توڑنا چاہتا تھا۔
دل و دماغ عجب کشمکش میں تھے۔
تم رحیم سے بات تو کرو۔۔۔
بہت سوچ وچار کے بعد اس نے افشی کو
اپنے دل کی بات بتائی تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔

مجھے ڈر ہے وہ ناراض ہو جائے گا۔

لو بھلا تم جائز طریقے سے رشتہ مانگ رہے ہو ارحم اس میں کوئی برائی نہیں۔

اور پھر کہیں تو وہ اپنی بہن کا رشتہ کرے گا نا۔

تو اپنے دوست سے کیوں نہیں -- ہم

ارحم نے گہرا سانس بھرا۔

میں کل ہی بات کروں گا۔

وہ کہیں اور رشتہ ہونے کی بات سے پریشان ہو گیا تھا۔

رحیم ......

ہاں

کچن میں برتن دھوتے رحیم نے گردن گھما کر ارحم کو دیکھا۔

وہ کافی پھینٹ رہا تھا۔

مجھے ایک بات کرنی ہے۔

مصروف سا انداز۔

"کہو۔" رحیم نے کپ کھنگالتے تجسس سے پوچھا۔

ارحم کے ہاتھوں کی حرکت رکی، گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئے۔

رحیمہ کے بارے میں --

رحیم کا برتن لگاتے ہاتھ ساکت ہوا۔

ارحم دھیرے سے اس کی طرف مڑا پھر نظریں اس سے ملائے۔

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ارحم کا دل معمول سے تیز دھڑکنے لگا۔ اس نے کپ رکھا اور بے اختیار ہاتھ دل پے پھیرا۔ ایک۔ لمبی سانس خارج کی اور پھر نظریں رحیم سے ملائیں۔

"میں رحیمہ کو پسند کرتا ہوں، اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

رحیم اس کے جذبات سے کچھ حد تک واقف تھا لیکن اس کے اقرار پر وہ ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

خاموشی لمحہ بھر طویل ہوئی، پھر اُس نے سنجیدگی سے ارحم سے نظریں ملائی۔

میں تمھاری بہت عزت کرتا ہوں ارحم لیکن -- میری بہن کی خوشی پر کوئی فیصلہ نہیں تھوپا جا سکتا۔ میں صرف اُس کی رضا کا احترام کروں گا۔ پہلے اُس سے بات کروں گا --- اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوا تو میرا جواب بھی مثبت ہوگا۔"

ارحم نے گہری سانس لی۔ دھڑکن اب تک معمول پر نہیں آئی تھی۔

تم میری سفارش نہیں کرو گے؟

ارحم نے کپ کے سرے پر انگلی گھماتے رحیم کو مخاطب کیا۔

اب کی بار رحیم نے گہرا سانس بھرا۔

میری نظر میں تم رحیمہ کے لیے پرفیکٹ چوائس ہو ارحم پر بات میری نظر یا خواہش کی

نہیں ہے۔

بات میری بہن کی خوشی اور مرضی کی ہے۔

ارحم کا دل اس کی پہلی بات پر ہلکا ہو کر آخری بات پر بھاری ہوا۔

میں امید کروں گا تم میرے حق میں اس سے کوئی بات کرو گے۔

رحیم نے اس کی تسلی کے لیے اثبات میں سر ہلایا۔

ارحم کو حقیقتاً تسلی ہوئی۔ دل ہلکا ہونے لگا تھا۔

تمھیں ارحم کیسا لگتا ہے رحیمہ

یونیورسٹی کے بنچ پر بیٹھی پانی پیتی رحیمہ کو رحیم کے سوال پر اچھو لگا۔

کیا مطلب۔۔

وہ اس کا سوال سمجھتے ہوئے بھی انجان بنی۔

تم جانتی ہو کیا مطلب۔

وہ سنجیدہ تھا۔

مجھے۔۔۔ رحیمہ نے لب کاٹے۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو رحیم۔۔۔

اس نے کچھ سمجھ نا آنے پر ایک خفا نگاہ رحیم کی طرف اٹھائی۔

وہ اچھا لڑکا ہے رحیمہ۔۔

"مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔"

اس نے کہتے ساتھ ہی فون کاٹا۔

رحیم بے بسی سے فون دیکھتا رہ گیا۔

اُس دن کے بعد سے رحیمہ نے ارحم کی غیر موجودگی میں رحیم سے بات کرنے کو فوقیت دی۔ وہ۔ اس سے کترا رہی تھی۔

یہ رویہ ارحم کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

جب مزید برداشت نہ ہوا تو اس نے رحیمہ سے براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

رحیمہ یونیورسٹی میں بیٹھی تھی جب سکرین پر ارحم کا نام جگمگایا۔ وہ تذبذب میں ڈوب گئی، لب بھینچ لیے۔ وہ اس کا محسن تھا۔ وہ اس کی کال نہیں کاٹ سکتی تھی۔ ہچکچاتے ہوئے کال اٹھائی، فون کان سے لگایا۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ صرف سانسوں کی مدھم سرگوشی سنائی دیتی رہی۔ پھر ارحم کی گھمبیر آواز ابھری۔

"تمھارا یہ رویہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے، رحیمہ۔"

کیا یہ رشتہ صرف ہمدردی تک محدود ہے؟"

رحیمہ کا دل ڈوبا۔

"اگر میں تمھارے احسانات گنتی تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، ارحم۔"

ارحم نے گہری سانس کھینچی۔

میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا۔۔۔

"تم ہر بات ایک طرف رکھ کر مجھے صاف بات بتاؤ..... کیا میرے لیے تمھارے دل میں کوئی جگہ نہیں؟"

رحیمہ کی پلکیں بھیگیں۔

ایسی بات نہیں ہے— اس کی آواز بہت دھیمی اور لہجہ بہت افسردہ تھا۔

ارحم نے اسے نہیں ٹوکا وہ اسے سننا چاہتا تھا۔

”مجھے شادی کے بعد کی جدائیاں خوف زدہ کرتی ہیں۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں......ایک گھر میں، ایک چھت تلے، ایک آسمان تلے۔“

ارحم کے ہونٹوں پر دھیرے سے مسکراہٹ آئی۔

وہ اس کی فکر سمجھتا تھا۔

”تمھیں لگتا ہے میں تم سے دور رہ سکوں گا؟

مجبوریاں سب کروا دیتی ہیں۔“

وہی افسردہ لہجہ۔

چاہے کوئی مجبوری ہو، کوئی کٹھن گھڑی، میں تمھیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

سوائے اُس دن کے جب زندگی کا وقت پورا ہو جائے۔

دونوں طرف ایک بار پھر سے طویل خاموشی چھائی رہی۔

”اگر تم اپنے وعدے پر قائم رہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

دھیمے سے عجلت میں کہتے اس نے فون رکھ دیا۔

چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ دھڑکن ہر طرف سے سنائی دے رہی تھی۔

دوسری طرف ارحم کی سماعت میں صرف رحیمہ کا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ دل و دماغ ایک دم ہلکا ہو گیا تھا۔

میں تمھارے فیصلے سے بہت خوش ہوں۔

رحیم، رحیمہ کے فیصلے پر مسرور تھا۔

اگر میں انکار کر دیتی تو۔

وہ حقیقتاً جاننا چاہتی تھی۔

رحیم نے مسکرا کر اس کی متجسس آنکھوں میں دیکھا۔

میں تمھیں مناتا، ارحم کی خوبیاں گنواتا، لیکن تمھارے ہر فیصلے میں اسی طرح تمھارے ساتھ کھڑا رہتا۔

رحیمہ کا دل اس کی بات سے سرشار ہوا۔

امی، ابو کو تو ارحم پہلے ہی بے حد عزیز تھا۔ چچا چچی نے انشی اور رحیمہ میں کبھی فرق کیا ہی نہیں تھا۔ قسمت ارحم اور رحیمہ پہ بے حد مہربان ثابت ہوئی تھی۔ رشتہ طے ہوا، مگر شادی رحیمہ کی تعلیم مکمل ہونے تک موخر کر دی گئی تھی۔

فاصلے اب بھی باقی تھے، مگر دل بے حد قریب ہو گئے تھے۔

انتظار بھی خوب صورت لگنے لگا تھا۔

ہر سانس نعمت محسوس ہوتی تھی۔

ہوا رحمت کا جھونکا۔

انتظار خوشبو بن گیا، اور زندگی سراپا شکر۔

☆☆☆☆☆

غزل

اے احتیاج یہ نمِ غم تاب اور ہے
سلکِ مژہ میں اک درِ ناب اور ہے

پھوٹیں ہوا کی شاخ پہ لہروں کی پتیاں
کھلنے کو پھر کوئی گلِ گرداب اور ہے

وہ پانیوں کی سطح تھی ، پانی کا شور تھا
منظر پسِ نگاہ تہِ آب اور ہے

یہ پانیوں کے بن ہیں کہ دہشت کے دشت ہیں
یہ شہر اور ہے کہ یہ سیلاب اور ہے

کجلا رہے ہیں نیند کے کہرے سے بام و در
شاید کفِ چراغ میں اک خواب اور ہے

یہ دھڑکنوں سے ہاتھ یہ صبحوں سی دستکیں
اک گوشِ کم نیوش پسِ باب اور ہے

تجھ پر دکھوں کی دھوپ چڑھے عمر ہو چکی
اے حزنِ یار ، آج تب و تاب اور ہے

جیبیں کھنگال لینا تو آنکھیں کھنگالنا
سلکِ مژہ میں اک درِ ناب اور ہے

خالد احمد

غزل

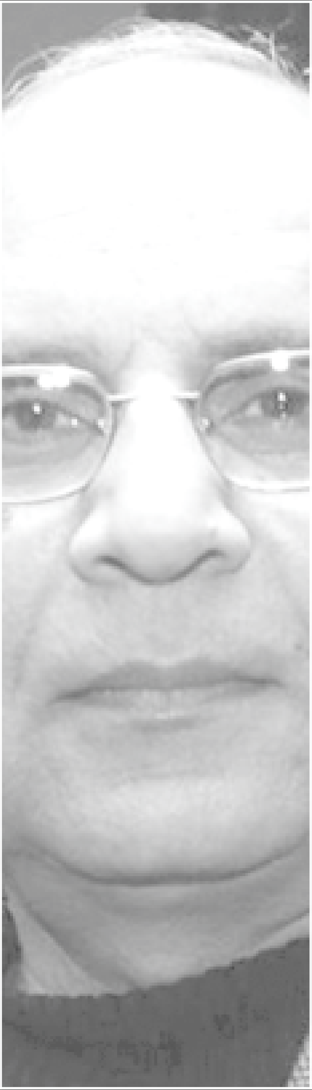

اب کون مکافات کے دوزخ سے نکالے
دھندلا دیے دانش نے بصیرت کے اجالے

گر سوچ ہی آہنگ و توازن سے تہی ہو
کیا تار زمانہ پہ کوئی خود کو سنبھالے

اک یاد بنا ہونا بھی کب ہونا ہمارا
کیا پھول گر اُس کی کوئی خوشبو ہی اڑا لے

منزل کہاں رستے کی خبر بھی نہیں تجھ کو
اوروں کی نہ کر فکر ذرا اپنا پتا لے

خود اوج ترا تیرے تعاقب میں چلے گا
تُو صدق سے من سوچ میں جینے کا مزہ لے

آ جائے تکبّر پہ اگر غیظ میں قدرت
کر دیتی ہے نمرود کو مچھر کے حوالے

تیزی سے اُترتا چلا جاتا ہے تہوں میں
باقی جو بچا ہے وہی انسان بچا لے

اک مصرعِ جاں تاب کسی کا کہکشاں سا
کس کام کے عالی یہ رسالوں کے رسالے

جلیل عالی

غزل

شب زاد ہیں باہر سے نکھارے ہوئے دن ہیں
سورج کی طرف ہاتھ پسارے ہوئے دن ہیں

پہلے کی طرح یہ بھی گزر جائیں گے اک دن
اے موسم گریہ یہ گزارے ہوئے دن ہیں

پھیلا ہے گھنا ٹوپ اندھیرا پس قرطاس
قرطاس پہ رنگوں سے سنوارے ہوئے دن ہیں

اب تک تو ہتھیلی کی لکیروں میں نہیں تھے
اے وحشت شب تیرے اتارے ہوئے دن ہیں

چھوڑیں گے انہیں اپنے ارادوں سے بدل کر
قسمت میں اگر جیت کے ہارے ہوئے دن ہیں

ہم ان سے مروت کا تقاضا نہیں کرتے
مجبور ہیں حالات کے مارے ہوئے دن ہیں

تھوڑی سی خوشی ڈھونڈ لیا کرتے تھے جن میں
اک ہاتھ کی پوروں پہ شمارے ہوئے دن ہیں

پلکوں سے اٹھا کر انہیں سینے سے لگا لو
صدقے میں کسی سر سے اتارے ہوئے دن ہیں

کیا ان کا بگاڑے گی کنور فصل خزاں بھی
یہ کاغذی پھولوں سے بہارے ہوئے دن ہیں

اعجاز کنور راجہ

غزل

تلاطم خیز موجوں سے سفینے کو بچانا ہے
کمال دست و بازو سے اسے ساحل دکھانا ہے

جگر کاوی سے صحراؤں کی کالی رت بھسم ہو گی
ہمیں ویرانیوں میں خوش نما منظر کھلانا ہے

تعلق ہے اسے اپنی انا کے خبط بے حد سے
وہ خود اس بوجھ سے خم ہے، اسے اب کیا جھکانا ہے

کسی کسب ہنر کی رونمائی بھی وظیفہ ہو
رگ و ریشہ کی آب و تاب کو باہر بھی لانا ہے

ستم خیزی پہ خاموشی کا جادو توڑنا ہو گا
دل بے حال کا بھی حوصلہ آخر بڑھانا ہے

کسی کو ناطقہ سر در گریباں دیکھ کر رونا
دل خرم کی شادابی پہ کھل کر مسکرانا ہے

دلوں میں بدگماں رنجش عذاب جان بنتی ہے
ہمیں ہر سوء ظن کو ہر طرح ہر سو مٹانا ہے

بہر صورت خرابی ہے خس و خاشاک کی صورت
ہمیں بے صورتی سے منظر خوش کو بچانا ہے

مقدم ہے ریاض احباب کی ہم کو خوشی ہر دم
وہ ہم پر مسکراتے ہیں، ہمیں بھی مسکرانا ہے

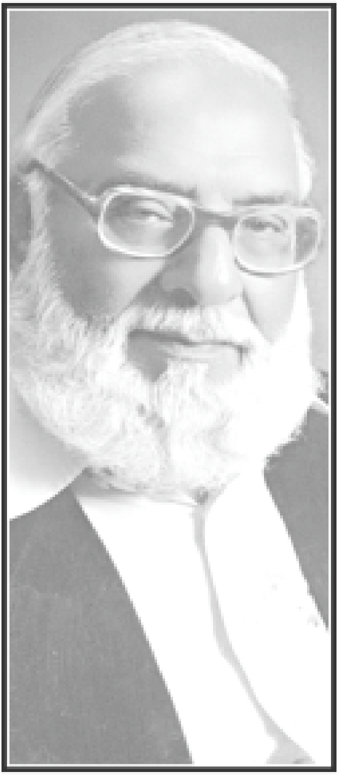

سید ریاض حسین زیدی

غزل

یہاں سے آگے تو اب اور کچھ نہیں ہے میاں
زمیں سے دُور بھی آ کر وہی زمیں ہے میاں!

یہ دشمنوں کا علاقہ نہیں، ذرا ہشیار!
یہاں جو دوست بھی ہے مارِ آستیں ہے میاں

دلیل کوئی نئی دو، کہ ہو سکوں قائل
نہ جانے کیوں متزلزل مرا یقیں ہے میاں!

مرے جنوں میں اضافہ جو دیکھتے ہو بہت
یہ سوچو، چاند کی شب بھی تو چودھویں ہے میاں!

ذرا میں دشت کا پھیرا لگا کے آتا ہوں
یہ دیکھوں، کون وہاں میرا جانشیں ہے میاں

پناہ دھوپ کی حدت سے ہم نے چاہی تھی
مگر یہ سایا زیادہ ہی آتشیں ہے میاں!

تو پھر مجھے تری آواز کیوں نہیں آتی؟
اگر تُو گوشۂ دل میں ابھی مکیں ہے میاں

کبھی ہمارے ہی دم سے تھیں محفلیں آباد
ہمارا ذکر مگر اب کہیں کہیں ہے میاں

مَیں کوئے یار سے واپس تو آ گیا ہوں نسیم
مگر یہ سچ ہے، مرا دل ابھی وہیں ہے میاں

نسیم سحر

غزل

ترکِ تعلقات پہ جی دنگ ہی سہی
تُو نے اگر چنا ہے یہی رنگ ہی سہی

ہم خاکسار خوش ہیں اسی فرشِ خاک پر
تجھ کو غرورِ افسر و اورنگ ہی سہی

آنا پڑا ادھر ترے اطوار دیکھ کر
اچھا مفاہمت نا سہی جنگ ہی سہی

ہم کانچ کے نہیں کہ بدن ٹوٹ جائیں گے
ہر ہاتھ میں ہمارے لئے سنگ ہی سہی

کچھ لوگ اب بھی ہیں وہی تیر و کماں لئے
صید افگنی کا آج نیا ڈھنگ ہی سہی

تری نوا درست ہے پھر تجھ کو فکر کیا
بزمِ صدا میں ہم غلط آہنگ ہی سہی

پرواز کے لیے ہیں کھلے آسماں بہت
گلزار اک چمن کی فضا تنگ ہی سہی

گلزار بخاری

غزلیں

رہیں گے یاد کرم دہر کی ہَوا کے ہمیں
کہاں کہاں نہیں لے جاتی تھی اُڑا کے ہمیں

وگرنہ کب کے پڑاؤ پہ آگئے ہوتے
ہماری گردِ سفر نے رکھا دبا کے ہمیں

یہ اَب ہمارا مقدر، جلیں کہ بجھ جائیں
ہَوا چلی گئی ہے طاق پر بٹھا کے ہمیں

جہاں نہ جانے کی کوشش میں ہم رہے تا عمر
اجل تو پھر وہیں لے آئی ورغلا کے ہمیں

بجھے ہُوئے تھے ستاروں کے قمقمے خاورؔ
خوشی منانی پڑی اپنا دل جلا کے ہمیں

خاور اعجاز

کسی آسیب کا مسکن ہے وہیں پانی میں
دھنس رہی ہے جہاں ساحل کی زمیں پانی میں

یوں ہی دریا نہیں پایاب ہُوا بیٹھا ہے
کوئی اُترا ہُوا ہے خاک نشیں پانی میں

چشمِ گرداب سے تو خود کو بچاؤں پہلے
ساز کرلوں گا نہنگوں سے کہیں پانی میں

یہ جو عکسِ رُخِ مہتاب نظر آتا ہے
پاؤں لٹکائے ہے اک زہرہ جبیں پانی میں

بلبلے ہیں یہ کسی آہِ حزیں کے شاید
کوئی ڈوبا ہُوا لگتا ہے یہیں پانی میں

کیسے دو لخت کیا بادِ فنا نے خاورؔ
خاک پر تخت ہے اور تاج و نگیں پانی میں

غزلیں

صفر ٹھہرا مطالعہ میرا
جوں کا توں ہے مغالطہ میرا

گلیوں گلیوں تھا گونجنے والا
گئے وقتوں میں قہقہہ میرا

دشت گردی کا عینی شاہد ہے
میرے پاؤں میں آبلہ میرا

کیسے کھولوں یہ بات آپس کی
مجھ پہ ہنستا ہے آئینہ میرا

اس قناعت کو کوئی کیا جانے
کب سے خالی ہے طاقچہ میرا

دائیں بائیں کی کیا خبر مجھکو
سیدھا سیدھا ہے سلسلہ میرا

پوری دنیا میں گھوم آیا ہوں
خود سے کم کم ہے رابطہ میرا

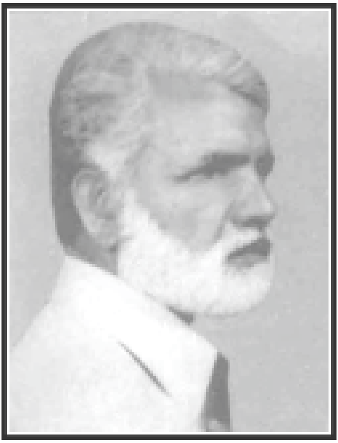

یعقوب پرواز

سکھلا رہے تھے جو مجھے حیوان دوستی
سمجھا رہا تھا میں انھیں انسان دوستی

معیارِ شرع و دیں کے سراسر بدل گئے
بس خال خال رہ گئی ایمان دوستی

اک دوسرے پہ جان چھڑکتے رہے اگر
چلتی رہے گی تجھ سے میری جان دوستی

اس دوست سے پیچھا چھڑاؤں تو کس طرح
سائے کی طرح ساتھ ہے نادان دوستی

لپٹا ہوا ہو جس طرح سایہ وجود سے
ہونے لگی ہے دونوں کی پہچان دوستی

وہ جس کا میل جول ہے میرے عدو کے ساتھ
دیتی ہے ایسے دوست کی نقصان دوستی

آگے بڑھیں خلوص سے یارانِ باوفا
پرواز ہم چڑھائیں گے پروان دوستی

غزل

آپ سے عرض یہ فرمانا ہے
دنیا اک پاگل خانہ ہے

بہروں کے گونگے ہیں معلم
اندھوں کا راجا کانا ہے

جس کو شہر سمجھتے ہو تم
مستقبل کا ویرانہ ہے

اور کوئی تدبیر اذیت
زخموں نے تو بھر جانا ہے

مشکل کام یہاں پر سب سے
سمجھے ہوئے کو سمجھانا ہے

پہلے بھی دیکھا ہے کہیں پر
چہرہ جانا پہچانا ہے

راحت سر سے پاؤں تک وہ
چلتا پھرتا مے خانہ ہے

راحت سرحدی

غزل

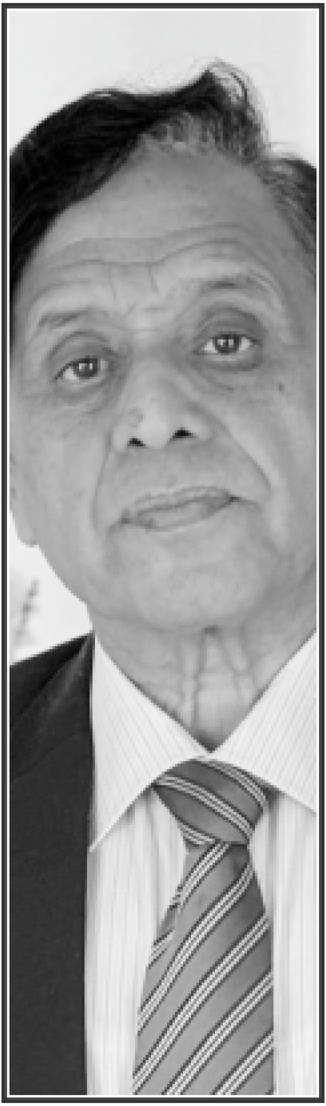

دل میں ارمان جگائے تھے بڑی مشکل سے
یاد کے دیپ جلائے تھے بڑی مشکل سے

ہم نے کچھ خواب دریچوں کی غلامی کی تھی
ہم نے کچھ ناز اُٹھائے تھے بڑی مشکل سے

آن اُتری ہیں خزائیں کہ ابھی تو ہم نے
دشت گلزار بنائے تھے بڑی مشکل سے

وہ مسافر جنھیں منزل کا پتا ہی نہ چلا
راستے بھول کے آئے تھے بڑی مشکل سے

اِس قدر قحطِ سماعت تھا بھری محفل میں
غم کے افسانے سنائے تھے بڑی مشکل سے

اِک سماں ایسا بہاروں کا اِدھر آیا تھا
راستے آپ سجائے تھے بڑی مشکل سے

وہ بھی اِس پار سلگتے ہوئے دیکھے ہم نثار
دوست جو پار بنائے تھے بڑی مشکل سے

نثار ترابی

غزلیں

کچے پکے پھل ہی کترتے، کیا کرتے
میں اور پنچھی، یہ بھی نہ کرتے، کیا کرتے

زندہ رہنا جنگل میں آسان تھا کیا
سانپ کا رُوپ جو لوگ نہ بھرتے، کیا کرتے

ڈوبنے کی انہونی آخر ہو جاتی
جھیل میں اپنے عکس اترتے، کیا کرتے

اپنے سارے یار ہواؤں جیسے تھے
ہم بھی لَو پر ہاتھ نہ دھرتے، کیا کرتے

کوئی گواہی اپنے حق میں آئی نہیں
ہونے سے ہم خود نہ مکرتے، کیا کرتے

غربت میں تو پیر ہی جوتے ہوتے ہیں
کوئی گِلہ زخموں سے کرتے، کیا کرتے

قیوم طاہر

سوکھتے جاتے اے دریاؤ، کیا کہتے ہو
ریگِ رواں سے پیاس بجھاؤ، کیا کہتے ہو

اک دن سیر پہ ہفت افلاک کی نکلو تم بھی
خاک کو تھوڑا سا اُکساؤ کیا کہتے ہو

اُس کا لہجہ، روز ہرا کر جاتا ہو گا
بھرنے لگتا ہے جب گھاؤ، کیا کہتے ہو

یاد کلائی میں اک گجرا باندھو تم
وہی اکیلے شام مناؤ، کیا کہتے ہو

رنگوں کی بوچھاڑوں میں جب دکھ بہہ جائیں
بند کرو آنکھیں سہلاؤ، کیا کہتے ہو

اک سناٹا، شہر کے گھر میں بستا جائے
پُرکھوں کے ڈیرے پر جاؤ، کیا کہتے ہو

آؤ، دکھ کی بارش میں رکھ آئیں طاہر
اُس تک جاتی کاغذی ناؤ، کیا کہتے ہو

غزل

جھوٹ کو سچ بتا رہے ہیں لوگ
اور سچ کو چُھپا رہے ہیں لوگ

جو پڑھاتے ہیں آگہی کا سبق
اُن کو بدّھو بنا رہے ہیں لوگ

دیر سے ہے اِدھر ٹریفک جام
پھر اِدھر ہی کو آ رہے ہیں لوگ

بھید کُھلتا نہیں ہے، کیا کیجیے
گھر کو کیسے چلا رہے ہیں لوگ

ریل گاڑی چلے، تو کیسے چلے
اُلٹا پہیہ گُھما رہے ہیں لوگ

دُور سے آ رہی ہیں آوازیں
کیا مدد کو بُلا رہے ہیں لوگ؟

ایک پتھر کی مُورتی ہے، جسے
کب سے بپتا سُنا رہے ہی لوگ

خود لگاتے ہیں آگ، جانِ انیس!
اور خود ہی بُجھا رہے ہیں لوگ

محمد انیس انصاری

غزل

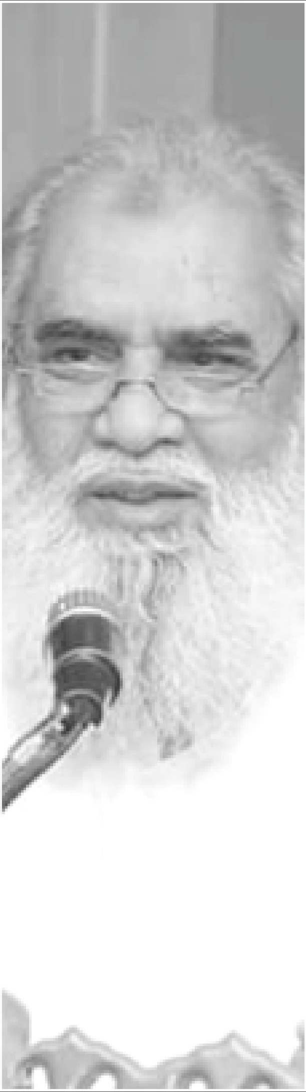

جہاں پہ آ کے سب حسن و جمال دیکھتے ہیں
وہیں پہ ایک دن حزن و ملال دیکھتے ہیں

سبھی یہ کہتے ہیں وہ ذہن سے نکلتا نہیں
سو اس کو ذہن سے اپنے نکال دیکھتے ہیں

جو ہم چلیں گے تو شہ مات ہوگی دیکھنا تم
ابھی سکون سے دشمن کی چال دیکھتے ہیں

ہم اس کی بزم میں جانے کا فیصلہ کر کے
لو آج اپنا ہی ذوق جمال دیکھتے ہیں

یقیں ہے پھر بھی کہ ہونا ہے سرخرو ہم نے
اگرچہ راہ میں ہر سمت جال دیکھتے ہیں

وہ آیا کرتا تھا پہلے تو سال سے پہلے
ہم اس کا راستہ اب سارا سال دیکھتے ہیں

ہم اس کی آس میں بیٹھے ہیں جھولی پھیلائے
کبھی تو آئے گا رزق حلال دیکھتے ہیں

ہے اس سے کیا کہ وہ کس کا ہے کون بیچتا ہے
خریدنا ہو جو اکرم وہ مال دیکھتے ہیں

اکرم ناصر

غزل

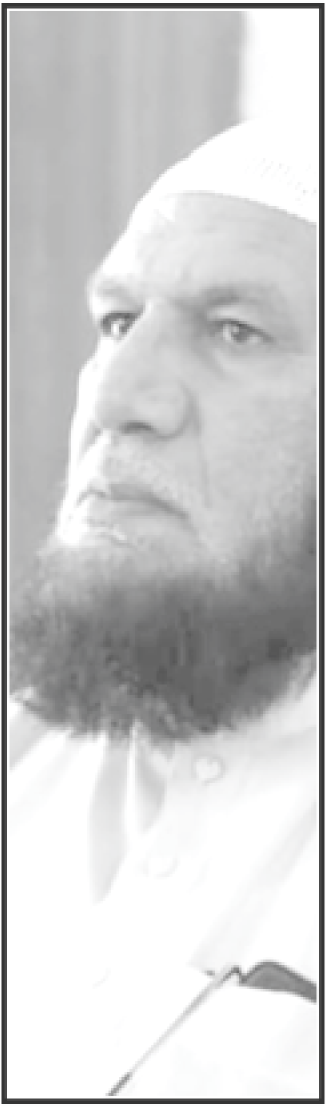

پہلے تو محسنوں کو شہیدوں میں رکھ لیا
پھر ساری عمر اپنے قصیدوں میں رکھ لیا

حسنِ عمل کے ساتھ سے محروم رہ گئی
تب آرزو کو خواب نویدوں میں رکھ لیا

وہ بھی ہے تخت و تاج کے آزار کا اسیر
اس کو بھی عہدِ نو کے یزیدوں میں رکھ لیا

سارے بدن میں نور کی ترسیل ہو گئی
وہ نام جب سے دل کی وریدوں میں رکھ لیا

میں ہوں فقیر میں نے بھی کشکول آنکھ کا
صحنِ حرم کے پھول چنیدوں میں رکھ لیا

تاریکیوں کی چار سو یلغار دیکھ کر
اک کوہ نور اپنی امیدوں میں رکھ لیا

میں تو جنابِ عشق کی تردید کو گیا
اس نے رضا مجھے بھی مریدوں میں رکھ لیا

رضا اللہ حیدر

غزل

تختِ شاہی سے اُتارے تو سبھی جائیں گے
موت جب آئے گی، مارے تو سبھی جائیں گے

بات قسمت کی ہے ملتا ہے کنارہ کس کو
ساگرِ خوں سے گزارے تو سبھی جائیں گے

سامنے رب کے فقط آئیں گے کملی والے
ورنہ محشر میں پکارے تو سبھی جائیں گے

جو کشیدہ ہیں وہ منظور نہیں حاکم کو
سَر وہ شانوں سے اُتارے تو سبھی جائیں گے

مکتبِ عشق میں گر آپ پڑھائیں گے حضور
جتنے بگڑے ہیں سنوارے تو سبھی جائیں گے

آگ کی بیلیں سبھی دل سے لپٹ جائیں گی
آتشِ غم میں نکھارے تو سبھی جائیں گے

یہ الگ بات نظر اس کی کرے کس کو قبول
گُل رُخِ یار پہ وارے تو سبھی جائیں گے

ہم نہ کہتے تھے عقیل عشق کرے گا تنہا
ایک اک کر کے سہارے تو سبھی جائیں گے

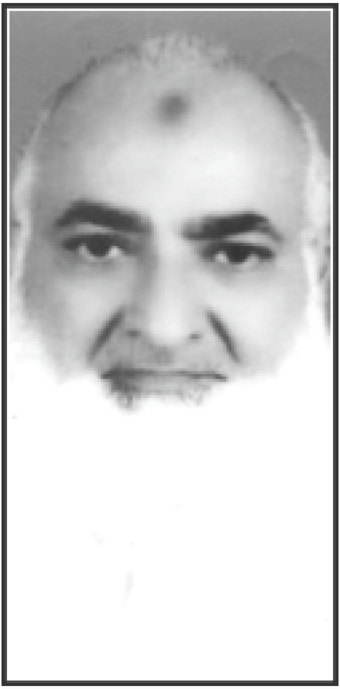

عقیل رحمانی

غزل

رنج سے آسمان روتا ہے
خون انساں زمیں سے دھوتا ہے

بارشوں میں فضاء نکھرتی ہے
پھول پتوں کا غسل ہوتا ہے

پھل کسی اور کا نصیب ہوئے
بیج بھی کوئی اور بوتا ہے

نیند گہری کہاں نصیب اسے
بیچ کر خواب کوئی سوتا ہے

مجھ کو اولاد سے بھی پیارا ہے
یہ جو رشتے میں میرا پوتا ہے

جو ملا ہے نصیب ہے اعجاز
بدنصیبی ہے گر یہ کھوتا ہے

اجمل اعجاز

انتخاب

خالد احمد

آواز کا جادو بھی جگانے نہیں دیتے
چڑیوں کو وہ اَب شور مچانے نہیں دیتے

نعمان منظور

غزل

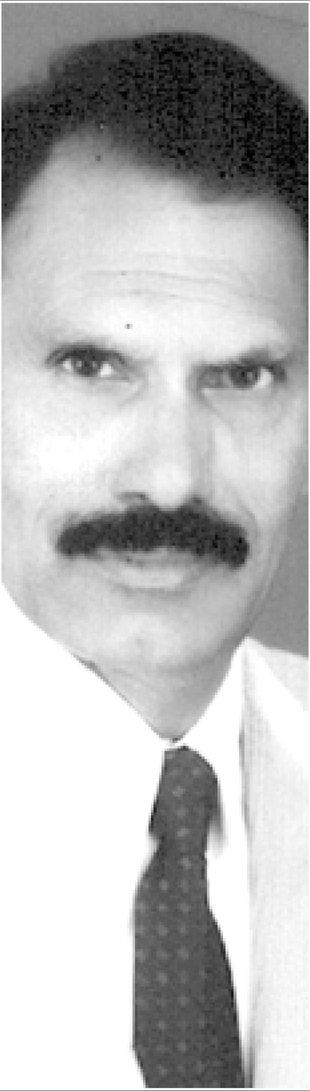

احمد جلیل

محبتوں کے چلن کھو گئے ہیں کس بن میں
چھپائے پھرتے ہیں اب لوگ نفرتیں من میں

بھٹک بھٹک کے مجھے منزلوں نے ڈھونڈ لیا
بڑا خلوص تھا گو راستوں کی الجھن میں

بہت محال ہے اب اس کی دسترس سے فرار
جو سانس سانس مہکتا ہے دل کی دھڑکن میں

سمیٹ رکھے گی آخر یہ زندگی کب تک
کہ ایک دن تو بکھرنا ہے عکس درپن میں

جھکا نہ میں تو ملا ٹوٹنے کا پھر اعزاز
یہ اور بات کہ اب کرچیاں ہیں دامن میں

وہ اور ہوں گے جنہیں دی ہیں خنکیاں اس نے
کہ ہم تو جلتے رہے ہیں برستے ساون میں

میں پھانک تو لوں قناعت کے زہر کو بھی جلیل
وہ اک تمنا بھی ہے خواہشوں کے آنگن میں

غزل

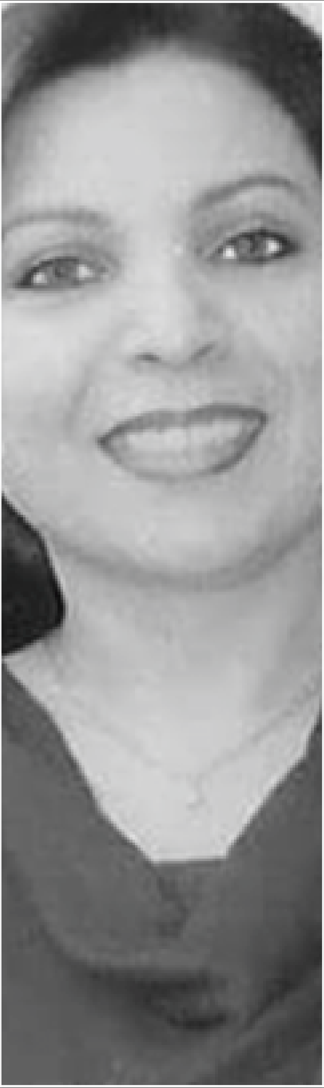

دل میں درد خدایا لکھا
میرا نام مسیحا لکھا

تیرا ساتھ افادہ لکھا
باقی عمر خسارہ لکھا

دوش نہیں کچھ اس میں تیرا
وہ ہی ہوا ہے، جو تھا لکھا

لوحِ زیست پہ اس سے آگے
کون یہ جانے کیا کیا لکھا

عمرِ رواں کے ہونٹوں پر ہے
پیاس کا تپتا صحرا لکھا

بابِ زیست کی پیشانی پر
جلی حروف میں تنہا لکھا

قیدِ تنہائی کی مد میں
ساری عمر کا عرصہ لکھا

خالدہ انور

غزل

رقص میں تھی میری حسرت بزم آرائی کے بیچ
اُس کی دلہن سج رہی تھی شورِ شہنائی کے بیچ

ہو گئی چارہ گری کچھ لمس کے احساس سے
گو دوا کچھ بھی نہ تھی دستِ مسیحائی کے بیچ

بڑھ گئی تھی پیار کے رشتوں میں انجانی خلیج
ایک دیوارِ انا اٹھی جو انگنائی کے بیچ

میری ماں کے ہاتھ خالی ہی کے خالی رہ گئے
ہو گیا تقسیم سب کچھ میرے ہر بھائی کے بیچ

زندگی کے لطف ہوتے ہیں تغیر سے سوا
حبس بھی اکثر ہوا کرتا ہے پُروائی کے بیچ

اُس کے دل کی بات ہونٹوں پر اگر آ جائے گی
کچھ نہ پھر باقی رہے گا میرے، رسوائی کے بیچ

رت جگے افروز رضوی کس نے بخشے آنکھ کو
کس کا ہے لطف و کرم اس کارفرمائی کے بیچ

افروز رضوی

غزلیں

ضروری کام ہے مگر میں کام کر نہیں رہا
دیے کے ساتھ ان دنوں کلام کر نہیں رہا

وہ شخص میری آنکھ کو بھلا لگا تو ہے مگر
عجیب یہ ہے دل میں وہ مقام کر نہیں رہا

ابھی تمہارے دشت سے غبار اٹھ نہیں رہے
ابھی مرا غزال بھی خرام کر نہیں رہا

ذرا سی دیر بیٹھنا ہے تیری سبز چھاؤں میں
یقین کر میں مستقل قیام کر نہیں رہا

اے جلد باز شخص تجھ سے خاص بات کیا کروں
ابھی میں عام بات کو بھی عام کر نہیں رہا

جو شخص ایک عمر تک سرِ نیاز خم رہا
وہ دور سے بھی آج کل سلام کر نہیں رہا

جو زندگی تھی وہ بھی مجھ سے ٹھیک تو نہیں کٹی
جو عشق ہے اسے بھی میں مدام کر نہیں رہا

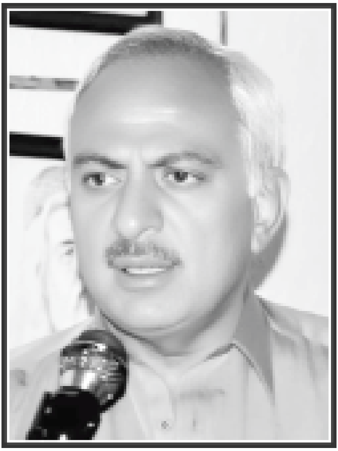

افتخار شاہد

کہیں کہیں پہ جو سبزہ اُگا ہوا ہے دوست
تمہارے پاؤں کا تلوا لگا ہوا ہے دوست

ہماری نیند ہمیں اس لیے بھی پیاری ہے
کسی کے خواب کا گلشن کھلا ہوا ہے دوست

کچھ اس لیے بھی مرے زخم بھر نہیں پاتے
تمہاری یاد کا ناخن بڑھا ہوا ہے دوست

تری تو خیر بہاروں نے پرورش کی ہے
مگر جو کالی رُتوں میں ہرا ہوا ہے دوست

تمام عمر چراغوں کو اوٹ دیتے رہے
تبھی تو ہاتھ پہ چھالا بنا ہوا ہے دوست

صدائے دشتِ جنوں اس لیے نہیں سنتے
ہمارے ساتھ گھرانہ جڑا ہوا ہے دوست

وفا کا ذکر تو بین السطور تھا شاہد
تمہارا رنگ کیوں پیلا پڑا ہوا ہے دوست

غزل

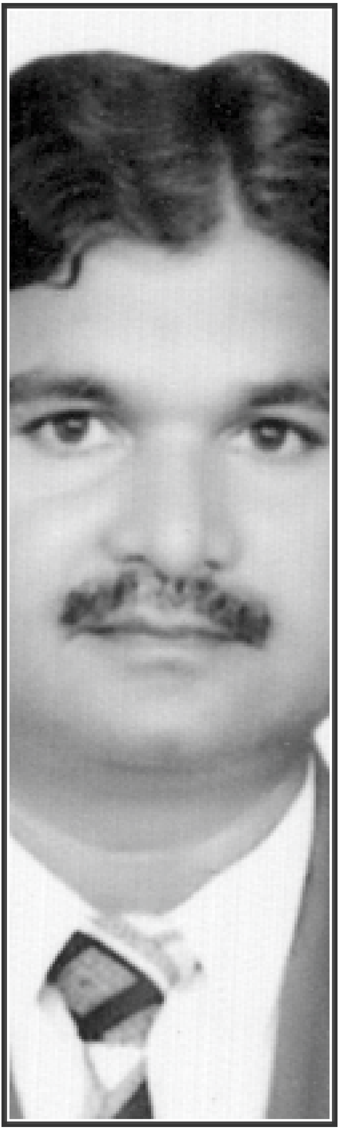

انصر حسن

ذرا سی بات پہ اتنا مجھے جلال آیا
دل و دماغ سے دنیا کو میں نکال آیا

میں چاہتا تھا کہ ظالم کہیں سے آ نکلے
مری غزل میں نہ لیکن مرا غزال آیا

یہ لوگ آگ نہ اُن کو جلا سکیں گے کبھی
مرے خطوں کو وہ ایسی جگہ سنبھال آیا

بجا کہ تُو ہے بہت صاحبِ کمال مگر
ہمارے کام نہ تیرا کبھی کمال آیا

وہ جس میں رونقیں لائی تھی دوستی اپنی
ستم تو یہ ہے کہ مُڑ کر نہیں وہ سال آیا

مرے رقیب نے ہنستے ہوئے کہا مجھ سے
ترے حبیب کو تیرا نہیں خیال آیا

زبان کاٹ کے تیرے سپرد کر دوں گا
مری زبان پہ کوئی اگر سوال آیا

ضعیف ہو کے بھی انصر جوان لگتا ہوں
تری دعاؤں سے مجھ کو نہیں زوال آیا

غزل

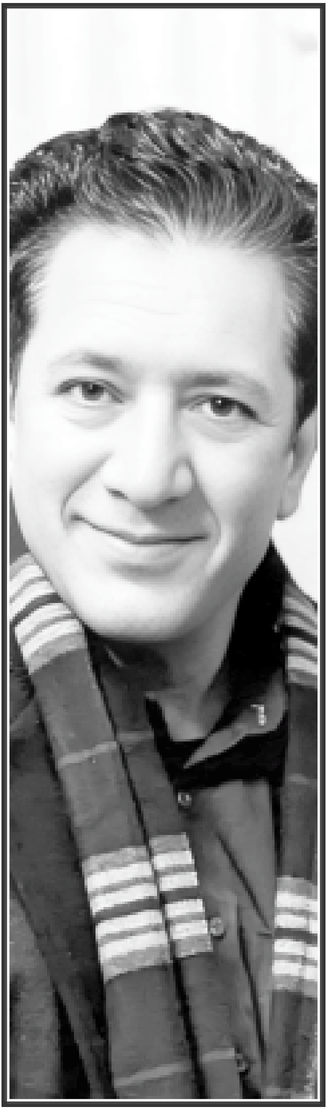

اک محبت عمر بھر سہمی رہی
ایک نفرت پھولتی پھلتی رہی

اس سے ہم لپٹے رہے اور زندگی
زندگی بھر موت سے لپٹی رہی

دل دھڑکتا ہی رہا اک آس میں
زندگی اک یاد میں ڈھلتی رہی

کوئی گزرا ہے گلی کے موڑ سے
رات بھر جیسے گلی مہکی رہی

پھر سفر الجھا رہا اک موڑ سے
اور اندھیرے میں گلی چلتی رہی

خواب ٹکراتے رہے پلکوں سے اور
نیند ٹی اسٹال پہ بیٹھی رہی

خواب تکیے سے مرے لپٹے رہے
رات کوریڈور میں پھرتی رہی

سو گئی اوصاف شب دالان میں
نیند روشن دان میں الجھی رہی

اوصاف شیخ

غزل

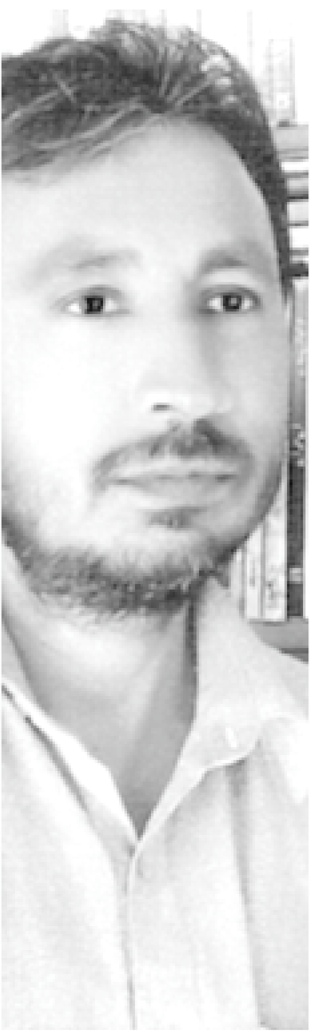

دریاؤں کے آپس میں کنارے نہیں ملتے
ہیں وہ بھی یونہی پاس ہمارے، نہیں ملتے

آنکھوں سے کہیں دل کی تہوں میں نہ اُتر جائے
ہم تجھ سے اِسی خوف کے مارے نہیں ملتے

ہر سال پلٹ آتے ہیں گزرے ہوئے موسم
لیکن جو ترے ساتھ گزارے نہیں ملتے

ملنے کو تو ملتے ہیں بہت لوگ جہاں میں
اپنی ہی طرح درد کے مارے نہیں ملتے

دیکھا ہے یہی ہوتا ہے اِس دنیا میں اکثر
ملتے ہیں اگر دل تو ستارے نہیں ملتے

دیکھے تھے کبھی ہم نے کسی شخص کے ہم راہ
آنکھوں کو ندیم اب وہ نظارے نہیں ملتے

ریاض ندیم نیازی

غزل

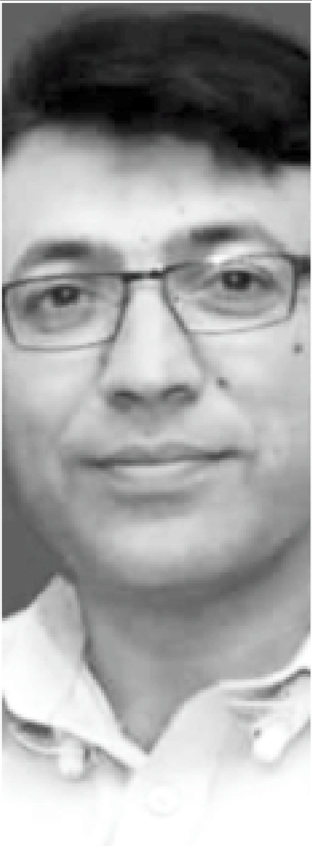

تیر سینے میں یوں پرو گیا ہے
زخمِ دل کا چراغ ہو گیا ہے

یادِ ماضی کی راکھ میں ڈھونڈو
ہر نیا خواب اس میں کھو گیا ہے

ہجر نے اس کو کیا نکھارا ہے
وہ بچھڑ کر حسین ہو گیا ہے

اب فقط جاگتی ہے درد کی رات
خواب تیرا تو کب کا سو گیا ہے

شعر عابد کے وہ مٹاتے ہوئے
انگلیاں خون میں ڈبو گیا ہے

عابد خان عابد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رُخِ حیات کا غازہ، مرا غبار تو ہو
مرے وقار میں شامل ترا وقار تو ہو

غزل

مختصر راستہ نہیں میرا
دشت بھر زاویہ نہیں میرا

عکس کو آپ سا دکھاتا ہے
اب مرا آئینہ نہیں میرا

میں اسے خواب میں ملوں کیسے
نیند سے رابطہ نہیں میرا

نیند ہے نیند کی طرح عاصم
خواب پر خواب سا نہیں میرا

عاصم اعجاز

چھپ گیا چاند اسکے آنچل میں
اب کوئی مشغلہ نہیں میرا

بس ترے ساتھ رہنا چاہتا ہوں
عشق تو مسئلہ نہیں میرا

ہاں اگر تو مجھے دعا دے تو
درد کچھ لادوا نہیں میرا

اب اسی حوصلے میں رہتا ہوں
آپ سے غم جدا نہیں میرا

ہجر کا فیض بھی ضروری ہے
وصل ہی مدعا نہیں میرا

غزل

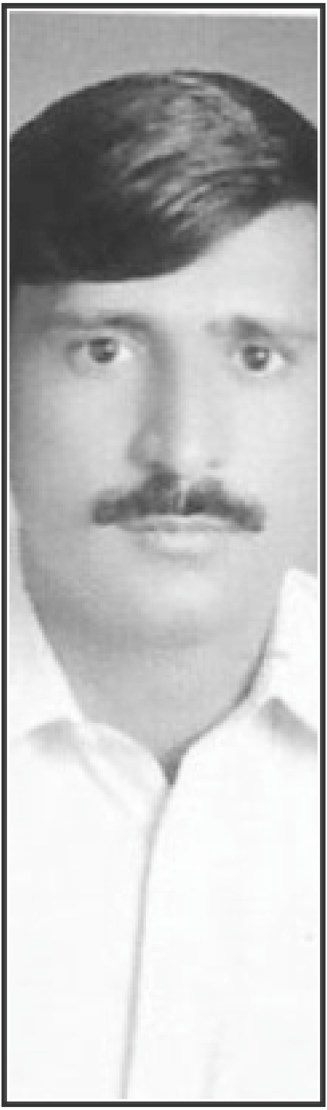

کیسے کہہ دوں کہ وہ نفرت سے مجھے دیکھتا ہے
وہ ہمیشہ ہی محبت سے مجھے دیکھتا ہے

میری آنکھوں میں عقیدت کے کنول کھلتے ہیں
جب بھی وہ چشمِ عنایت سے مجھے دیکھتا ہے

خود پہ وہ بار سمجھتا نہیں مجھ کو ہرگز
دیکھتا ہے تو سہولت سے مجھے دیکھتا ہے

گرچہ احسان بھی کرتا نہیں مجھ پر لیکن
یوں بھی ہوتا ہے کہ چاہت سے مجھے دیکھتا ہے

اس کے اخلاص و محبت پہ یقیں ہو کیسے
ایسے لگتا ہے مروت سے مجھے دیکھتا ہے

وہ بھی کہتا ہے نہیں مجھ کو شکایت تم سے
دیکھنے والا وضاحت سے مجھے دیکھتا ہے

میری اس بات میں ہے کتنی صداقت دانش
وہ حقیقت میں عقیدت سے مجھے دیکھتا ہے

اعجاز دانش

غزل

ہم نے کہنا ہے ، جو نہیں کہتے
آپ کہتے ہیں ، لو! نہیں کہتے

آپ کو بے وفا کہیں اور ہم؟
کہنا بنتا ہے گو نہیں کہتے

کس کو کہتے کہ سُنیے حالِ دل
ہم اگر آپ کو نہیں کہتے

آپ کے بارے میں مرے اشعار
وہ بھی کہتے ہیں جو نہیں کہتے

وہ جو کہتے ہیں دل نہیں سمجھا
جو سمجھتا ہے وہ نہیں کہتے

اک غزل جو کبھی نہیں ہم نے
آپ کہتے ہیں سو نہیں کہتے

روز کہتے ہیں ہم کہیں تم سے
جانے کیا ہے کہ جو نہیں کہتے

آپ سے گفتگو بہانہ ہے
ہم کوئی شعر تو نہیں کہتے

دل ملے ہوں تو دو نفوس کو لوگ
ایک کہتے ہیں دو نہیں کہتے

جو کہا ہے وہ کہلوایا گیا
ہم کوئی آپ تو نہیں کہتے

آپ بین السطور پڑھیے تو
ہم جو کہتے ہیں وہ نہیں کہتے

آپ سے تم ہوئے زمانہ ہُوا
آپ کو آپ تو نہیں کہتے

بے وفائی کرے بھی تو ساگر
بے وفا ، یار کو ، نہیں کہتے

محمد سلیم ساگر

غزل

ریگ سے صحرا بنا تو ڈر گیا
پیڑ سے پتا گرا تو ڈر گیا

ناز تھا وہ جس کو اپنی چال پر
دو قدم جب بھی چلا تو ڈر گیا

بے خبر وہ وسعتِ بے باک سے
بحر سے دریا ملا تو ڈر گیا

آئینہ گر نے تراشا آئینہ
آئینے نے سچ کہا تو ڈر گیا

آبیاری خفتِ جاں ہو گئی
بیج سے پتھر اگا تو ڈر گیا

دوسروں کے درد سے ناآشنا
خود ہوا جب مبتلا تو ڈر گیا

کرنے والا ہر کسی سے دل لگی
عشق سے پالا پڑا تو ڈر گیا

سایہ اک پالا تھا ناظر دھوپ میں
سایہ ہی ڈسنے لگا تو ڈر گیا

اقبال ناظر

غزل

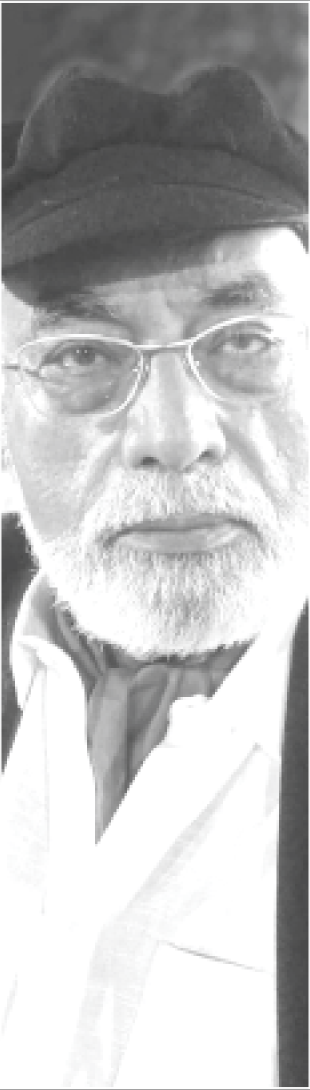

زندگی کی ، پہ ہر نفس نہیں کی
اور اس پہ بھی اس نے بس نہیں کی

اُس نے چاہا ، گزار دی جائے
اور ہم نے بھی آلکس نہیں کی

بہہ گئے سب ، بہ موجۂ ہستی
ایک نے بھی تو پیش و پس نہیں کی

رونقِ جسم و جاں رہی لیکن
روح سر رشتۂ قفس نہیں کی

ہم پہ توصیف کا عبث الزام
ہم نے تکذیب خار و خس نہیں کی

کیوں پشیماں ہے ، دے کے تنہائی
تو نے خود سے تو ، ہم نفس نہیں کی

یہ عبارت جو دل پہ ہے تحریر
تجھ فسانے سے ، مقتبس نہیں کی

طارق بٹ

غزل

سجدہ کم کیا میں نے
سر کو خم کیا میں نے

تیرے آستانے کو
محترم کیا میں نے

میں بھی کربلائی ہوں
اپنا غم کیا میں نے

اس کا نام لے لے کر
خود پہ دم کیا میں نے

اپنے دل کے شیشے کو
جام جم کیا میں نے

میکدے کی چوکھٹ کو
آشرم کیا میں نے

تجھ کو بھول بیٹھا ہوں
کیا ستم کیا میں نے

آسماں کو چھو آیا
اتنا رم کیا میں نے

آنکھ ہو رہی بنجر
دل کو نم کیا میں نے

تو نے پھر جفائیں کیں
پھر کرم کیا میں نے

منتشر زمانے کو
پھر بہم کیا میں نے

اپنے دست و بازو کو
پھر علم کیا میں نے

شہرِ یارِ نفرت کا
سر قلم کیا میں نے

اک غزال کو اصغر
ہم قدم کیا میں نے

اصغر علی بلوچ

غزلیں

صفحہ کھردرا ہونا چاہیے
لفظ میں غصہ ہونا چاہیے
وہ کہتے ہیں دیکھ کے لاشے
نوحہ دھیما ہونا چاہیے
جی کرتا ہے عشق بساط پہ
تجھ سا مہرہ ہونا چاہیے
بازو پہ چوری کا بندر
چڑیا گھر کا ہونا چاہیے
سپنا کھیت کسان سڑک اور
ہاتھ میں کھرپہ ہونا چاہیے

جنگل میں جنگل ہو اس پہ
شہر کا دھوکا ہونا چاہیے
اس سے ملنے کی خواہش ہو
دل بھی پیاسا ہونا چاہیے
کھیلتے کھیل زمستانوں کا
گلشن دہکا ہونا چاہیے
چلتی گاڑی کو سندیسہ
شاعر بوسہ ہونا چاہیے

تنویر قاضی

بادل چھینٹا ہونا چاہیے
بگ کا پیاسا ہونا چاہیے
ہو جاتے ہیں رام کبوتر
دانہ دنکا ہونا چاہیے
جس کے کھو جانے کا ڈر ہو
ایک سراپا ہونا چاہیے
نیند اترائی آ جاتی ہے
کاندھا مہکا ہونا چاہیے
لوٹ آئے طائر تو اس کے
منہ میں تنکا ہونا چاہیے

لال لکیر کے اوپر چیخیں
غربت شجرہ ہونا چاہیے
بیگانے پن سے نکلیں تو
آخری دنگا ہونا چاہیے
بام چڑھے تو سارے دیکھیں
دکھ زہریلا ہونا چاہیے
سارے لوگ مضافاتی ہوں
شہر میں جلسہ ہونا چاہیے

غزل

لگ کر گلے سے ہم ترے روئیں گے اور کیا
اشکوں کو کشتِ شام میں بوئیں گے اور کیا

جب ختم ہو گا جاگتی راتوں کا یہ سفر
سر پر زمین کھینچ کے سوئیں گے اور کیا

ہر ذرے کو سمیٹ کے لائے ہیں قبر تک
اپنے بدن کے بوجھ کو ڈھوئیں گے اور کیا!

گھر کے سوا بھی جائے اماں ہونی چاہیے
تیرے بدن میں خود کو سموئیں گے اور کیا

رکھا ہے اپنی آنکھ کا پانی سنبھال کر
دل پر لگی سیاہیاں دھوئیں گے اور کیا

یہ جو محبتوں کے سبھی دعوے دار ہیں
اک دن یہی بھنور میں ڈبوئیں گے اور کیا

اتنی طویل عمر کی خواہش نہیں فگار
چہرے کے رنگ و نقش ہی کھوئیں گے اور کیا

سلیم فگار

غزلیں

ایسا ممکن ہو سکتا ہے
پتھر دل بھی رو سکتا ہے

ہائے کسی کی لگ سکتی ہے
چین تمہارا کھو سکتا ہے

غیروں کے گن گانے والا
اپنا کیسے ہو سکتا ہے

چاہے بستر کانٹوں کا ہو
سونے والا سو سکتا ہے

ہاتھ پکڑ کے رکھنا اس کا
بچہ بھیڑ میں کھو سکتا ہے

افضل بزم میں ہنسنے والا
تنہائی میں رو سکتا ہے

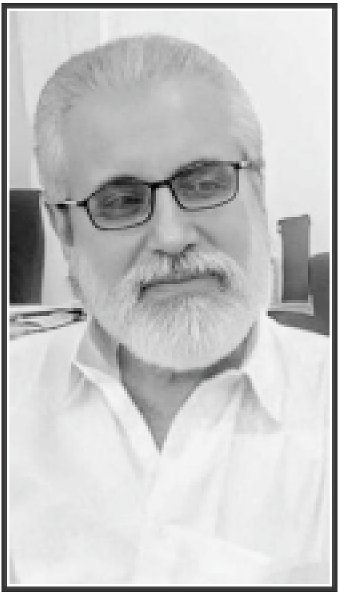

افضل ہزاروی

ہم اپنی نظر سے کہاں دیکھتے ہیں
"تمہاری نظر سے جہاں دیکھتے ہیں"

مہذب ہے کتنا کوئی اہلِ محفل
لبادہ نہیں ہم زباں دیکھتے ہیں

جہاں سے ملے کچھ خلوص و محبت
چلو کوئی ایسی دکاں دیکھتے ہیں

جو حق میں ہمارے عدالت میں آئے
بدلتا ہم ان کو بیاں دیکھتے ہیں

کہاں لے کے آئی بصارت ہماری
کہ ہر گھر سے اٹھتا دھواں دیکھتے ہیں

انہیں مال و دولت سے مطلب ہے یارو
غریبوں کی جانب کہاں دیکھتے ہیں

جو کرتے ہیں سودا محبت کا افضل
کہاں پھر وہ سود و زیاں دیکھتے ہیں

غزل

چپ بیٹھا میں کیا کیا سوچتا رہتا ہوں
آخر میں کیوں اتنا تنہا تنہا ہوں

پہروں جن کی جھیل میں کھویا رہتا ہوں
ان آنکھوں کی یاد میں ڈوبا رہتا ہوں

تم جو باتیں بھول چکے ہو مدت سے
میں تو ان میں اب بھی اُلجھا رہتا ہوں

تم بدلو تو بدلو اپنی راہ مگر
میں تو ایک ڈگر پر چلتا رہتا ہوں

سادہ پن کچھ نیکی ہی کا نام نہیں
دیکھنے میں تو میں بھی سیدھا سادا ہوں

تیرے گھر بھی پہنچا ہے یہ شور بھی
یا میں ہی انجان صدائیں سُنتا ہوں

گھر کی دیواروں میں یوں دل تنگ نہ ہو
ڈھونڈ مجھے میں اس گھر کا دروازہ ہوں

کیا کہیے یہ کیسے زمیں ہموار ہوئی
اس صحرا میں کیسے پانی لایا ہوں

جس نے پیار سے دیکھا اس کے ساتھ ہوا
سچ پوچھو تو میں بھی اب تک بچہ ہوں

انجم میں کیوں دنیا پر الزام رکھوں
آنکھیں ہیں تو پھر کیوں ٹھوکر کھاتا ہوں

انوار انجم

غزل

وہی جو شخص مرا مدعا بنا ہوا ہے
زمانے بھر کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے

مرا نصیب مجھے راستہ نہیں دیتا
یہ بدنصیب مرا دائرہ بنا ہوا ہے

مرے وجود پر اک روشنی کا ہالہ ہے
کوئی چراغ مرا رہنما بنا ہوا ہے

یہ اختیار مکمل نہیں کسی کے پاس
یہاں تو ہر کوئی اچھا برا بنا ہوا ہے

یہ کون روز مجھے ڈانٹتا ڈپٹتا ہے
یہ کون ہے جو مرا ناخدا بنا ہوا ہے

کوئی سبب تو تری بے رخی کا باعث ہے
تو بے وفا تو نہیں بے وفا بنا ہوا ہے

نفاق جاتا نہیں گر لہو میں رچ جائے
اسے تو دیکھ ذرا کیا ہے کیا بنا ہوا ہے

ابھی تلک میں اسے بھر نہیں سکا احمد
مرے وجود میں جو اک خلا بنا ہوا ہے

احمد ساقی

غزل

غور سے دیکھا جو اُس کی سمت تو ایسا لگا
جس کو صحرا میں نے سمجھا تھا مجھے دریا لگا

جس کو بھی سمجھا، سمجھنے سے رہا وہ ماورا
جس کو بھی دیکھا مجھے میری طرح تنہا لگا

میں کہاں جاتا علاجِ تشنہ کامی کے لیے
اس برس ابرِ بہاراں بھی مجھے پیاسا لگا

تُو بظاہر اِس طرح کا آدمی ہرگز نہیں
جانے کیوں تیرے بچھڑ جانے کا ہے دھڑکا لگا

ٹوٹ بھی سکتے ہیں یہ طوق و سلاسل ایک دن
کھل بھی سکتا ہے درِ زنداں پہ یہ تالا لگا

اُس کی آنکھوں کی بناوٹ اُس کے چہرے کے نقوش
ہُو بہ ہُو اک اجنبی مجھ کو ترے جیسا لگا

اِک ہجومِ بے کراں ہے جس طرف دیکھو مگر
اتنے انسانوں میں کوئی بھی نہیں اپنا لگا

آئنے کو دیکھ کر حیرانیاں جاتی نہیں
جب بھی دیکھا اپنا چہرہ بھی ترا چہرہ لگا

ایک اِک رشتہ بنانے میں کئی صدیاں لگیں
اور تعلق ٹوٹنے میں صرف اِک لمحہ لگا

ہم سے اب آزادیِ اظہار بھی چھننے لگی
پھر سے لب سِلنے لگے اظہار پہ پہرا لگا

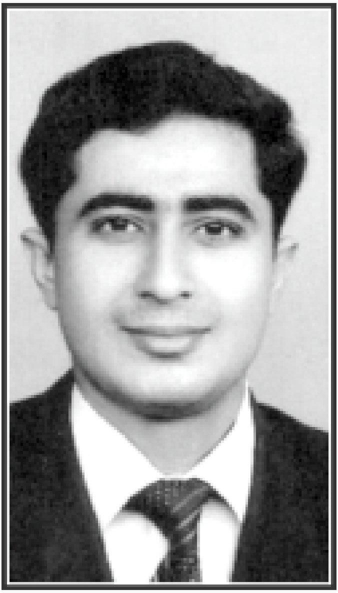

نبیل احمد نبیل

غزل

جانے کہاں سے آئی اداسی بھری ہوا
کھینچی ہے سانس سانس میں سُچی کھری ہوا

گم صم ترے خیال میں بیٹھا ہوا ہوں میں
چھُو کر گزر رہی ہے مجھے مرمری ہوا

ذرّے سُلگتی ریت کے دامن پہ ہیں مرے
اِتنی بھی اب نہیں ہے مری بے زری، ہوا!

آیا ہوں سخت حبس زدہ میں ترے نگر
کرنے لگی ہے مجھ سے بہت دلبری ہوا

ایسا دیا جلا ہے کہ اب تک بُجھا نہیں
ٹُوٹی ہے پہلی بار تری خود سری، ہوا!

ساون میں دیکھ جلوہ گری سبز رنگ کی
دھرتی ہری، فضا ہے ہری اور ہری ہوا

پیاسا کوئی مرا ہے کسی دشت میں کہیں
کرتی ہے چیخ چیخ کے نوحہ گری ہوا

رہتی نہیں کسی بھی جگہ مستقل امر
پھرتی ہے اپنے ساتھ لیے بے گھری ہوا

امر مہکی

غزلیں

اکرم جاذب

اس حسن کا شباب گزرنے سے پیشتر
خود کو بدلنا سب کے بدلنے سے پیشتر

سامانِ شادمانیِ دائم ہی بن گئی
اک سرسری نگاہ بچھڑنے سے پیشتر

ان شبنمی لبوں میں رہا، کون مانے گا
میری رگوں میں زہر اترنے سے پیشتر

بخشا ہے عشق نے مجھے کامل شعورِ ذات
انجان تھا اس آگ میں جلنے سے پیشتر

مکار لوگ حیلے کریں جتنے بھی یہاں
سب راز تو کھلیں گے ہی مرنے سے پیشتر

جاذب کوئی بھی حوصلہ کیسے دکھائے گا
ٹھوکر اگر لگے گی سنبھلنے سے پیشتر

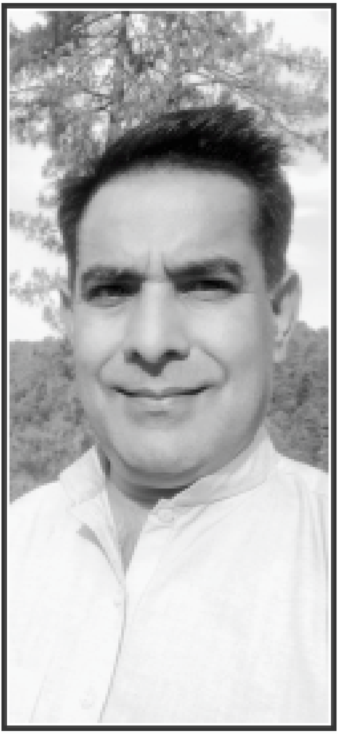

کار جہاں میں جی کو لگانے کے باوجود
وہ یاد آ رہا ہے بھلانے کے باوجود

دنیا کا ہو کے دل کہاں رہتا ہے یار کا
مٹتا نہیں یہ داغ مٹانے کے باوجود

محرومیاں چھپا نہ سکا داستان گو
محفل میں دوستوں کو ہنسانے کے باوجود

تصویر اپنی دیکھ کے راضی نہیں کوئی
چاروں طرف اس آئنہ خانے کے باوجود

پہچان کر وہ صورتیں پہچان سے گیا
مدہوش ہے جو ہوش میں آنے کے باوجود

ٹوٹا نہیں بشر سے کبھی رشتہ آس کا
جاذب فریب خلق سے کھانے کے باوجود

غزل

غیر آباد جزیروں پہ بھی گلفام ملے
کیسے کیسے تجھے انعام بھی ہیں عام ملے

پھول سوکھے ترے باغوں میں پرانے والے
تیرے جاروب کشوں کو بھی کوئی کام ملے

دشت کی وحشتیں اور باغ کی ویرانیاں ہیں
مجھے کیا کیا نہ ترے پیار میں آرام ملے

رہی خوش بختی ہماری ہے یقیناً یہ بھی
جتنے انسان ملے ، خوگرِ آلام ملے

کتنے صحراؤں میں دریاؤں کی تھی ہم کو تلاش
اتنی آسانی سے کب کوئی ہمیں نام ملے

کوچۂ یار میں راحت کا سماں ایسا ہے
کوچۂ یار میں بیمار کو آرام ملے

تو نے گرویدہ بنایا ہے عجب اس دل کو
صبح ملتا ہے تو کہتا ہے قمر شام ملے

قمر نیاز

غزل

مسئلے حل طلب نہیں رہے کیا
پہلے ہوتے تھے، اب نہیں رہے کیا

دیکھتے ہو نہ بولتے ہو کچھ
کیا ہُوا، چشم و لب نہیں رہے کیا

کانپتے تھے جو تیری ہیبت سے
اب وہی لوگ دب نہیں رہے کیا

اب فقط سیدھا چل رہے ہو تم
دائیں، بائیں، عقب نہیں رہے کیا

کر دیا ہے شمار سے باہر
ہم ترے منتخب نہیں رہے کیا

وہ جو ہوتے تھے جاں بہ لب تیرے
وہ ترے جاں بہ لب نہیں رہے کیا

دوست ہوتے تھے میرے چاروں طرف
دوست وہ سب کے سب نہیں رہے کیا

دل سے کرتے تھے جو ادب میرا
وہ مرے بے ادب نہیں رہے کیا

کہاں کھوئے ہو ان دنوں نازش!
شاملِ روز و شب نہیں رہے کیا

شبیر نازش

غزل

چل دیے سب ہی اپنی سمتوں کو
چھوڑ کے ہم سے دل شکستوں کو

سانپ پالے ہیں آستینوں میں
یوں نبھایا ہے ہم نے رشتوں کو

اپنا گھر بھی کہیں پہ ہوتا تھا
بھول بیٹھے ہیں اب تو رستوں کو

خود گنوایا تھا اپنے ہاتھوں سے
دوش کیوں دے رہے ہو بختوں کو

مل کے بیٹھیں کبھی کہیں دو پل
دل ترستا ہے بیتے وقتوں کو

میں نے امید ہی نہیں باندھی
کون اب تھامتا ہے گرتوں کو

نائلہ راٹھور

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا، مجھے حیران رکھنا

غزلیں

افتخار الحق

کبھی لہو کبھی اشکوں سے گل کھلاتے ہیں
وہ سبز باغ جو ہم کو دکھائے جاتے ہیں

ہم اپنے مہرے مہارت سے جب چلاتے ہیں
ہمارے شاہ پیادے سے مات کھاتے ہیں

بھنور اسی سے لگا بیٹھتا ہے دل اکثر
کسی کنارے سے کشتی جو ہم لگاتے ہیں

گا رہی ہے لکیریں جو بدنصیبی کی
اسی ہتھیلی پہ سرسوں بھی ہم جماتے ہیں

دھواں بناتا ہے ہر رات آسماں مجھ کو
چراغ جلنے سے پہلے مجھے بجھاتے ہیں

مرا مدار مرے زائچے مری چالیں
ستارے چلتے ہوئے پھر بھی لڑکھڑاتے ہیں

رشتہ کوئی نبھا نہ سکا خاک دان سے
روٹھا کبھی زمین کبھی آسمان سے

ویرانیوں نے دیکھ لی بربادیوں کی راہ
جڑنے لگا ہے دشت ہمارے مکان سے

دیوارِ دل کے کان میں سرگوشیاں ہوئیں
مہماں الجھ پڑے نہ کہیں میزبان سے

لفظوں کو بطنِ معنی رہائی نہ دے سکے
نکلے نہیں ہیں تیر کسی بھی کمان سے

اک آرزو لیے کہ چھوئے انتہا کوئی
ہٹتا رقیب کیسے کبھی درمیان سے

ڈرتا ہوں روک لے نہ وہ تزئین کا عمل
کر لوں کوئی سوال جو معمارِ جان سے

اے ممتحن اصول و ضوابط ذرا بدل
کرنا ہے اختلاف مجھے امتحان سے

ماحول کس جہان میں کھویا کسے خبر
رقصاں ہوا بیان جو حسنِ بیان سے

آ سرحدِ وصال کے اس پار تک اڑیں
کچھ اور لطف لیں گے ادھر کی اڑان سے

غزل

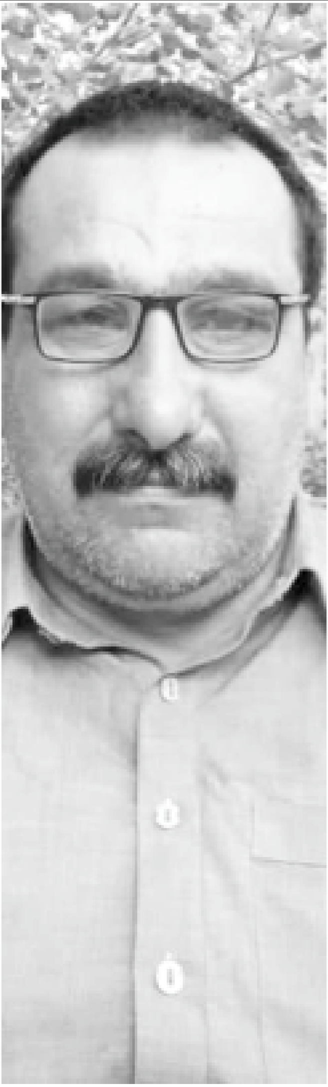

لمحہ لمحہ اُداس جیون ہے
پیاس صحرا میں یاس جیون ہے

نفرتوں کے ہجوم میں اکثر
یہ خوشی کا قیاس جیون ہے

ہم کو پتے سمجھ کے بانٹا گیا
اس لیے بھی زراس جیون ہے

بدگمانی ہے موت کی مانند
خالی خالی یہ آس جیون ہے

سخت جاڑے کے برف موسم میں
ہم نے پایا کپاس جیون ہے

ایسی لگتی ہے زندگی طاہر
جیسے خالی گلاس جیون ہے

سید طاہر شیرازی

غزل

اور پھر یوں ہوا اس آنکھ پہ اُترا منظر
آنکھ نے دیکھا نہ پہلے کبھی ایسا منظر

ذہن و دل اس کو منانے سے ہیں قاصر اب بھی
وقت کے پردے پہ اس طرح سے اُبھرا منظر

میری مُٹھی میں وہ جگنو سا کبھی چمکا تھا
کاش ہو سکتا کبھی قید سنہرا منظر

آج بھی یاد اسے چاہے تو چھو سکتی ہے
لوح دل پر ہوا نقش اتنا وہ گہرا منظر

یاد سے مٹتے جزیروں کے نشاں ڈوب گئے
میں نے چاہا بھی تو منظر میں نہ ٹھہرا منظر

دودھ کی نہریں بھی ہمت سے نکل آتی ہیں
کوہکن ہو تو بدل سکتا ہے تیشہ منظر

جیسے رخشندہ مہ و سال رہ ماضی کے
کاش ہو سکتا کبھی ویسا ہی فردا منظر

لمحۂ رد و قبول آتا ہے لحظہ بھر میں
کوئی دیکھے تو سجا کر کبھی توبہ منظر

دنیا جتنے بھی بدل ڈالے مناظر انجم
عشق میں ہوتا ہے بس ایک ہی اُجلا منظر

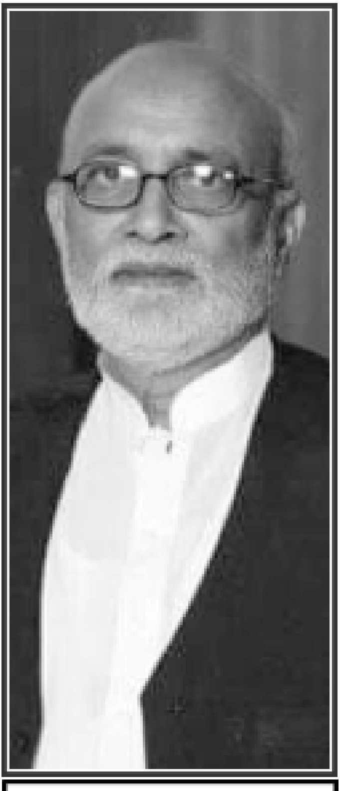

محمد افضال انجم

غزل

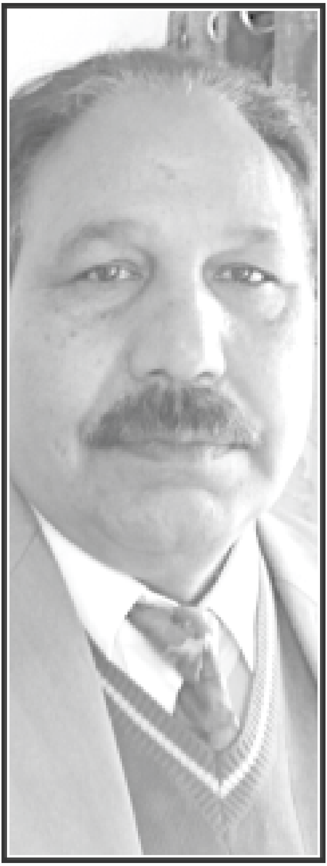

ہیں غزل میں ترے سبھی اسلوب
مصرعے کہتے ہیں مرے محبوب

لب کمر زلف سینے کی محراب
علم سارے عروض کے ہیں خوب

یہ محبت بنی ہوس ہے دوست
کوئی طالب رہا نہ ہے مطلوب

کسی بھی قوم کا ہے کیا معیار
دیں پتہ رہنے سہنے کے اسلوب

سرکشی سے تری ارے انسان
ہے مسیحا تو آج بھی مصلوب

کس کو تو نے لکھا ہے محسن چاند
جانتا ہے زمانہ یہ بھی خوب

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرمِ نوا رہتے ہیں

غزل

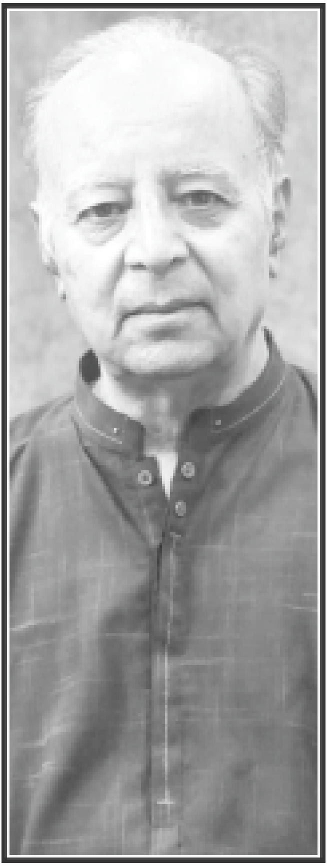

سمیع اللہ عرفی

ہوں وہ تہذیب جو کھنڈرات میں زندہ ہے کہیں
میرا ماضی بھی مری ذات میں زندہ ہے کہیں

اسکی آنکھوں میں جوابات کو پڑھ سکتا ہوں
جو مری چپ کے سوالات میں زندہ ہے کہیں

اسکو جب چاہوں میں دریافت بھی کر سکتا ہوں
کسی پتھر وہ کسی دھات میں زندہ ہے کہیں

کوئی بھٹکے جو اندھیرے میں تو وہ خضر بنے
وہ تو جگنو ہے ہر اک رات میں زندہ ہے کہیں

اسکو مرحوم میں لکھتے ہوئے ڈر جاتا ہوں
وہ جو شعروں میں مری بات میں زندہ ہے کہیں

عرفی جب چاہوں میں تصویر بنا لوں اسکی
میں مصور ہوں مرے ہات میں زندہ ہے کہیں

انتخاب

- خالد احمد -

لڑکھڑا کر دم نہ دے دیں ڈگمگاتی دوریاں
دل میں بجھتی لو کی صورت کپکپاتی دوریاں

نعمان منظور

غزل

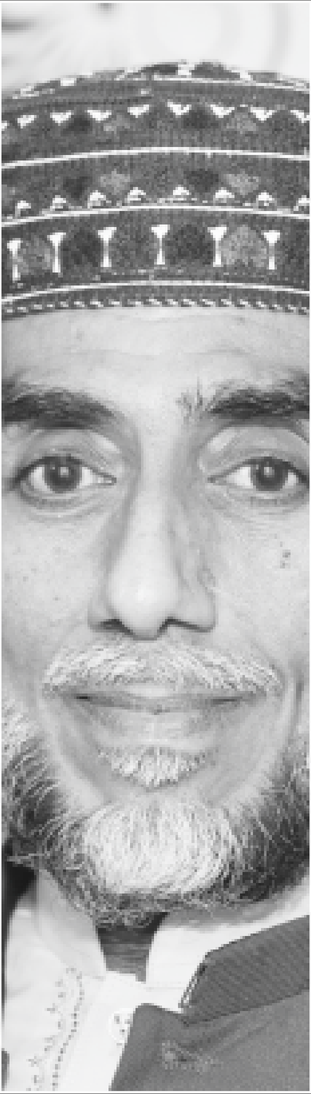

در دلِ مجذوب یہ سارا جہاں ہے رقص میں
پوچھیے درویش سے کون و مکاں ہے رقص میں

جب ٹھہرنے میں یقینی موت ہے جانِ جگر!
کیوں نہ پھر کہیے، حیاتِ جاوداں ہے رقص میں

طبعیاتی منظروں کی گردشوں کو چھوڑیے
قریۂ مابعد بھی تو ہر زماں ہے رقص میں

چاند تاروں کا مسلسل دائرہ جاتی سفر
یہ خبر دیتا ہے خود بھی آسماں ہے رقص میں

ساقیٔ مدہوش بھی لرزیدہ ہے رندوں سمیت
ساغرِ لبریز ہی تنہا کہاں ہے رقص میں

چھڑ گیا جوں ہی ذرا اِک لہر میں سازِ ازل
فلسفے کی بس وہیں سب این و آں ہے رقص میں

زخم کا رنگِ ہویدا ہی نہیں ہے مرتعش
درد بھی فیضانؔ با سوزِ فغاں ہے رقص میں

فیض رسول فیضان

غزل

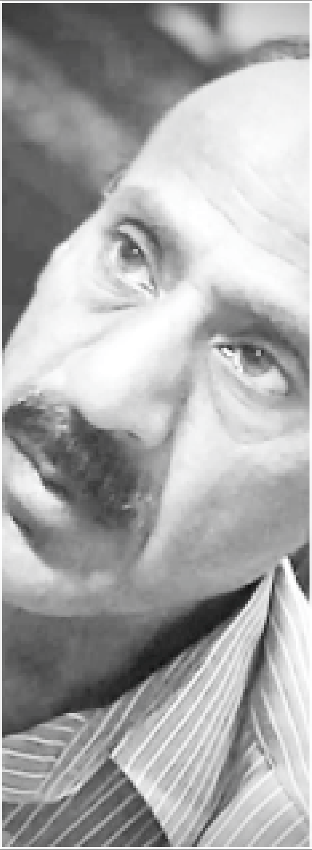

کوئی شعلہ ابھی بھڑکا نہیں ہے
وہ پتھر غار کا سرکا نہیں ہے

محبت کر رہے ہیں ہم انہی سے
جنہیں ہم نے کبھی دیکھا نہیں ہے

ویسے پر ہے کھانا بہتریں پر
بزرگوں کا کہیں حقہ نہیں ہے

سنا ہے چاند پر دیکھا کسے پر
وہ بوڑھی مائیں اور چرچا نہیں ہے

زمانہ چل رہا ہے چال ایسی
سمجھ آتا ہے پر دکھتا نہیں ہے

سبھی کچھ دیکھتا رہتا ہے لیکن
حقیقت جو ہے وہ کہتا نہیں ہے

لگی ہے دوڑ قیصر اپنی در تک
اگرچہ در ابھی کھلتا نہیں ہے

نبیل قیصر

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشم تر گیا تھا

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غزل

آپ کو جتنا ہم سمجھتے ہیں
لوگ تو اِس سے کم سمجھتے ہیں

جو تری آنکھ میں اُترتا ہے
ہم اُسے اپنا غم سمجھتے ہیں

خوش لباسی ہے شکل غربت کی
لوگ جس کو بھرم سمجھتے ہیں

شاہ کی ایک مسکراہٹ کو
شہر والے کرم سمجھتے ہیں

اُن کی آنکھوں میں اشک رہتے ہیں
کربلا کا جو غم سمجھتے ہیں

میرے سینے میں جھانکیے صاحب
آپ اُن کا ستم سمجھتے ہیں

کام کا چھوڑتی نہیں اقبال
اِس محبت کو ہم سمجھتے ہیں

اقبال سروبہ

غزل

طلسمِ شب میں ستارے تلاش کرتے ہوئے
میں تھک چکا ہوں سہارے تلاش کرتے ہوئے

خدا کے گھر سے ہی اس کا سراغ ملتا ہے
پہنچ ہی جائیں گے سارے تلاش کرتے ہوئے

مرے یقیں نے اچھالا سمندروں سے مجھے
بھنور میں تھا میں، کنارے تلاش کرتے ہوئے

جدید دور کے بچے گھروں میں بیٹھ گئے
ملا نہ کوئی غبارے تلاش کرتے ہوئے

محبتوں کی نئی داستاں رقم کر دیں
کوئی تو ہم کو پکارے، تلاش کرتے ہوئے

پہنچ ہی جاؤں گا منزل کے آس پاس نوید
میں زندگی کے خسارے تلاش کرتے ہوئے

محمد نوید مرزا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برق رَو راہ برو! لوگ رہے جاتے ہیں
مگر اے راہ گرو! فرصتِ تاخیر کہاں

غزل

سسکتی شام ، اُداسی، خیال تیرا ہے
بچھڑنے والے یہ رنج و ملال تیرا ہے

ہزار زاویے بدلے ہیں دیکھنے کے مگر
ہماری آنکھ میں حُسن و جمال تیرا ہے

جدائی چاٹ گئی ہے مجھے تو اندر سے
پری جمال بتا کیسا حال تیرا ہے

شغف نہیں تھا مجھے شاعری سے ایسا بھی
مرا سخن سے لگاؤ ، کمال تیرا ہے

گدائے حُسن ہوں کاسے کی لاج رکھ سائیں
کہ دید رزق ہے لب پر سوال تیرا ہے

میں اپنے آپ کو اس واسطے نہیں ملتا
مری نگاہ میں ہر پل وصال تیرا ہے

انا پرست کو اتنا بتا کبھی ارشد
مرا عروج ہی وقتِ زوال تیرا ہے

ارشد محمود ارشد

---------- انتخاب ----------

- خالد احمد -

------- نعمان منظور -------

کوئی بات کو بات نہ جانے
کوئی بال کی کھال اُدھیڑے

غزل

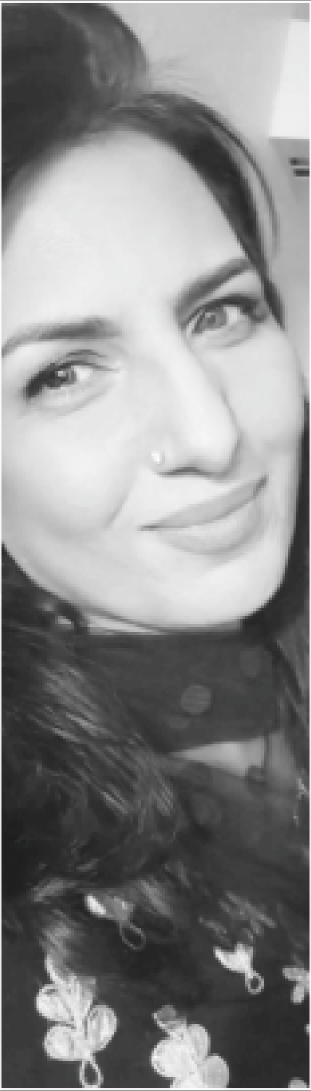

دل مضطرب کو ، یہ راحت ملے بس
محبت کے بدلے، محبت ملے بس

جنوں کو بھی حق ہے، کہ صحرا میں اس کو
پذیرائیِ عشقِ وحشت ملے بس

ہو تہمت میں شامل ،اگر شوقِ رخصت
قیامت میں تجھ کو ندامت ملے بس

ملو تم جہاں پہ ، نہ کوئی وہاں ہو
محبت میں اتنی سہولت ملے بس

کبھی تم سے خط وکتابت بھی ہوگی
ذرا گھر کے کاموں سے فرصت ملے بس

حکومت کروں پھر میں دنیا کے دل پہ
ترے دل کی پہلے حکومت ملے بس

ازل سے ابد تک یہ خواہش ہے الماس
مری آنکھ کو تیری صورت ملے بس

الماس شبی

غزل

نعیم عباس

ہم جو ہر بار تری بات میں آ جاتے ہیں
گھوم پھر کر اسی اوقات میں آ جاتے ہیں

جب اسے باقی نہیں رہتی ضرورت میری
درجنوں عیب مری ذات میں آ جاتے ہیں

جا پہنچتے ہیں جہاں رزق بلاتا ہے ہمیں
گھر سے چلتے ہیں، مضافات میں آ جاتے ہیں

ہجر کے دن تو عموماً بھی نہیں ہیں آسان
اور مجھ پر یہی برسات میں آ جاتے ہیں

خامشی ، شرم جھجک اور تبسم جیسے
کچھ اشارے ہیں جو اثبات میں آ جاتے ہیں

ہم ستارے ہیں میسر نہیں آتے دن میں
عشق زادوں کے لیے رات میں آ جاتے ہیں

ہاتھ کیا ہاتھ میں آتا ہے کسی کا ساجد
سارے حالات مرے ہاتھ میں آ جاتے ہیں

غزل

یہ جانتا ہوں یہاں پر نہیں کہیں کچھ بھی
جگہ کہاں ہے جہاں پر نہیں کہیں کچھ بھی

خلا میں کہکشائیں، ستارے سیارے
کہا یہ کس نے وہاں پر نہیں کہیں کچھ بھی

بچشم و گوش دل دوستاں سے دیکھو سنو
صدا دریدہ دہاں پر نہیں کہیں کچھ بھی

ہماری آنکھوں میں جھانکو تو دیکھ پاؤ گے
کوئی بھی شکوہ زباں پر نہیں کہیں کچھ بھی

صدائے سوز دروں ہو کہ کار مضرابی؟
دلان چارہ گراں پر نہیں کہیں کچھ بھی

چمن میں مسلی ہوں کلیاں کہ پھول بکھرے ہوں
گرانی طبع گراں پر نہیں کہیں کچھ بھی

ہزار، فلسفے ، دانش ، نظام ہائے جہاں
نشان نظم جہاں پر نہیں کہیں کچھ بھی

راجہ عبدالقیوم

غزل

ہاتھ میں جب رنگ آ ہی جائیں گے
لوگ میرے سنگ آ ہی جائیں گے

میں تو خود سے بھی ہوں اکتایا ہوا
آپ مجھ سے تنگ آ ہی جائیں گے

کس طرح مجھ کو رکھیں گے ہم سفر
سامنے جب ننگ آ ہی جائیں گے

کون کس کے ساتھ ہو گا پھر یہاں
جب دلوں پر زنگ آ ہی جائیں گے

دنیا داری جان لیں گے آخرش
جینے کے سب ڈھنگ آ ہی جائیں گے

کاش کوزہ گر اگر چھو لے مجھے
مجھ پہ پھر سے رنگ آ ہی جائیں گے

واسطہ جب بھی پڑے گا ہیر سے
راہ میں 100 جھنگ آ ہی جائیں گے

امجد خان تجوانہ

غزل

ایسے پرواز کی نقشِ کفِ پا نے میرے
بن گئے انفس و آفاق ٹھکانے میرے

اک نگاہ کرم ان کی نہیں ملتی ورنہ
مجھ کو دے رکھی ہے ہر چیز خدا نے میرے

جو بھی دکھ درد ملے سب ہیں عنایات تری
”تجھ ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے“

جب بھی کرتا ہوں کوئی عقدۂ دل ان کو پیش
ہائے بن جاتے ہیں انجان سیانے میرے

کیسے ایامِ گزشتہ کو بھلا دوں یک دم؟
یاد ہیں آج بھی دنیا کو فسانے میرے

خیر ماضی میں جو ہونا تھا ہوا لیکن اب
لگ رہا ہے کہ ہیں آئندہ زمانے میرے

اب کوئی تازہ غمِ عشق عطا ہو مجھ کو
ہو گئے سانحے نعمان! پرانے میرے

نعمان محمود

غزل

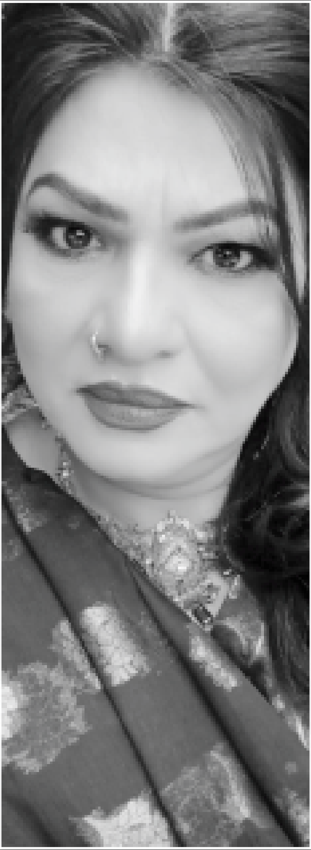

ساری دنیا پہ عیاں راز مسلسل ہوتا
مسئلہ زیست کا تجھ سے بھی نہ جو حل ہوتا

لمحہ لمحہ تجھے برسوں کے برابر لگتا
چشم و نظارہ میں حائل مرا آنچل ہوتا

راہ میں مجھ کو ٹھہرنا ہی نہیں تھا کسی طور
دشت ہوتا کہ مرے دوست، کوئی جل ہوتا

کیسے شاداب نظر آتی بھلا لوگوں کو
کچی نیندوں سے اگر سر مرا بوجھل ہوتا

نہ سہی میرے مقدر میں جو تعبیر نہیں
کم سے کم خواب کسی طور مکمل ہوتا

فرصت گریہ میسر نہ ہوئی مجھ کو جیا
ورنہ یوں روتی کہ ہر سمت ہی جل تھل ہوتا

جیا قریشی

انتخاب

– خالد احمد –

نعمان منظور

آنکھ کب جھپکے گی، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خواب رواں! ہے تری تعبیر کہاں

غزلیں

قدم قدم پہ اذیت نے سر قلم کیا ہے
پھر اس کے بعد سخن ور نے مجھ پہ دم کیا ہے

میں جھیلتا چلا آیا ہوں جس کی وحشت کو
اسی کے خوف سے تصویر کو بہم کیا ہے

گرفت تھوڑی سی مربوط کر رہا ہوں میں دوست
مجھے خبر ہے کہ کس کس نے یہ کرم کیا ہے

سفر سے لوٹ کے آؤں گا اور دیکھوں گا
کہ کس نے منہ مرا نوچا ہے کس نے غم کیا ہے

ملے گا وقت تو سوچوں گا اس کے بارے میں
حضور آپ نے احساں جو دم بہ دم کیا ہے

طلسم گاہ سے آئیں گی جب صدائیں ندیم
میں تب کہوں گا کہ میں نے بھی کچھ رقم کیا ہے

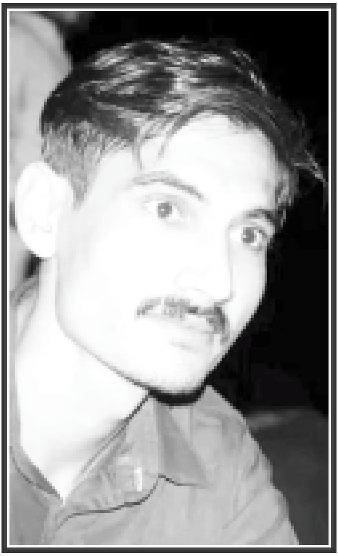

ندیم ملک

اس اداس بستی میں کون سی مصیبت ہے
یعنی اس مصیبت میں دوستوں کو راحت ہے

اُس بلا کی آنکھوں میں اور کچھ نہیں لیکن
اُس بلا کی آنکھوں میں اجنبی کی صورت ہے

اور کچھ نہیں پیارے گارگاہ دنیا میں
جس طرف نظر جائے اُس طرف قیامت ہے

سرمئی نگاہوں کو سرمئی نگاہوں سے
پہلے پہلے نفرت تھی اور اب محبت ہے

اُس نے اپنے ہاتھوں پر نام لکھ دیا میرا
بس یہ دیکھ کر مجھکو اب کی بار حیرت ہے

اِس سرائے فانی میں اور مری کہانی میں
ایک سا بنا کردار ایک جیسی حالت ہے

میں ندیم دیکھوں گا بزم عشرت غم کو
کون میرا اپنا ہے کس کو مجھ سے نفرت ہے

غزل

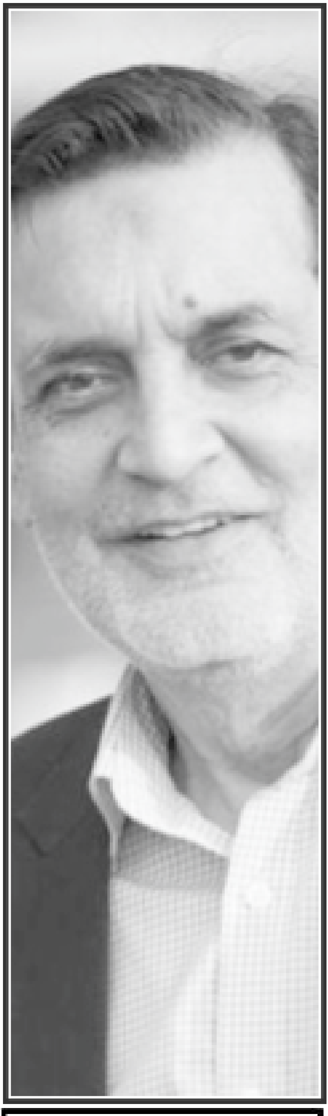

حسن پرویز سید

اسکی خبروں سے مجھے کوئی سروکار نہیں
جو میری بات بھی سننے کا روادار نہیں

بات کو ان سنی کر دے جو نہیں تجھکو پسند
اس طرح مجھ پہ لگا قدغنِ افکار نہیں

حُسن رشتوں کا ہے احساس بیاں کرنے میں
رفعتِ دوستی جز خوبیءِ اظہار نہیں

اس میں رہنے دے خدا کے لئے بے ساختہ پن
اپنوں کا حلقہ ہے فرعون کا دربار نہیں

بحرِ ذخار میں ڈھلنے کو ہے دریا کا خروش
دیتے ہیں دل کا سکوں اب مجھے اشعار نہیں

کتنے ناگفتہ خیالات ہیں، جن سے سیدؔ
ہر گھڑی اہلِ نظر رہتے ہیں دو چار نہیں

غزل

پتھروں کی بارشوں میں کارواں شیشے کا تھا
دور تک ریگِ رواں تھی یا گماں شیشے کا تھا

ریزہ ریزہ ہو گئی ابلیس کی آہن گری
مرحلہ کچھ اور زیبِ داستاں شیشے کا تھا

جسم کی سب جھریاں تھیں ارمغانِ ماہ و سال
کیا قصور اس میں بھلا اے جانِ جاں! شیشے کا تھا

کرچی کرچی کر گئی آخر اسے بارانِ سنگ
پتھروں کے درمیاں میرا مکاں شیشے کا تھا

آ گیا خالق بھی اپنے عکس دکھلاتا ہوا
یوں لگا جیسے وہ میرا مہرباں شیشے کا تھا

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

منظر تھے دھیان میں لبِ جُو کس دیار کے
آنکھوں میں تیرنے لگے بجرے خمار کے

غزل

مستحسن جامی

عشق کی خاک کو در در نہیں رکھا جاتا
سب کے سینوں میں یہ جوہر نہیں رکھا جاتا

یہ عجب نقطۂ حیرت ہے سمجھنے کے لیے
نُور کو نار کے اندر نہیں رکھا جاتا

اُس نے جذبے مِرے نیلام کیے ہیں ورنہ
گھر کے سامان کو چھت پر نہیں رکھا جاتا

اب کسی طور تذبذب سے بھرے سینے میں
مضمحل ہجر کا خنجر نہیں رکھا جاتا

اُس کی تصویر بنائی نہیں جاتی مجھ سے
کیمرہ ایک ہی رُخ پر نہیں رکھا جاتا

کبھی صورت کبھی قیمت سے پرکھ ہوتی ہے
ہیرا سونے کے برابر نہیں رکھا جاتا

غزل

خموش صحرا میں ہجر و غم نے نگار خانہ بنا لیا ہے
حنوطی یادوں نے دل کے اہرام میں ٹھکانہ بنا لیا ہے

بدل رہا ہے ہر ایک منظر کھلی ہوئی آنکھوں میں ہمارے
تصوراتی نظر نے اپنا الگ زمانہ بنا لیا ہے

جو چیز حرکت میں رہ رہی ہے ہدف میں آتی نہیں ہے ہرگز
شکاری کے آگے ہم ہی بت ہیں، ہمیں نشانہ بنا لیا ہے

ہجوم کرنے لگا ہے اپنے جنوں سے سڑکوں پہ فیصلے اب
عدالتیں کھل گئیں سرِ عام خود ہی تھانہ بنا لیا ہے

سیاسی بازی گروں کے دجالی شعبدوں نے اثر دکھایا
عوامی اُمیدوں کی حقیقت کو پھر فسانہ بنا لیا ہے

ہنکائے جاؤ گے سمتِ نادیدہ کی طرف اپنے ہی گھروں سے
ہر ایک بستی میں دشمنوں نے وہ تازیانہ بنا لیا ہے

فریب نے پھر یقین کی گانٹھ میرے ہاتھوں میں کس کے باندھی
کسی نے وعدے کی لاج رکھنے کا پھر بہانہ بنا لیا ہے

عجب سی چُپ لگ گئی ہے دلشاد ان دنوں کیوں مرے سخن کو
کسی کی معصوم خامشی نے مجھے دوانہ بنا لیا ہے

دلشاد نظمی

"ارتعاش" پر چند حروف شاباش!

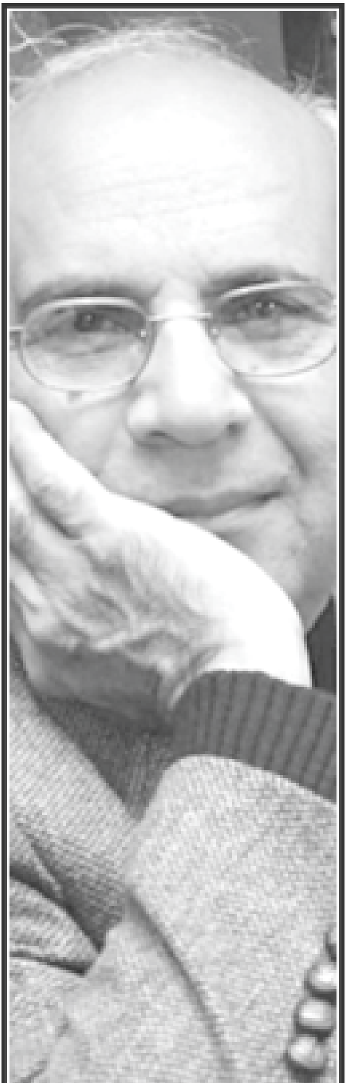

جلیل عالی

نوید ملک شوقیہ شاعر نہیں۔ شاعری اس کی وجودی مجبوری ہے۔ اس کی شاعری اس کے فکرو احساس کی مسلسل ٹوٹ پھوٹ اور تشکیلِ نو کی روداد ہے۔ اس کا بنیادی مسئلہ اپنے وجود کی کلیت کے ساتھ جینے کا جتن ہے۔ وہ نئی تعبیر و ترتیب پر آمادہ ہو سکتا ہے مگر خارجی زندگی اور تھیوری کے مطالبے پر اپنی ذات کے کسی گوشے سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ اس اعتبار سے وہ ایک صاحبِ واردات شاعر ہے اور اپنی واردات کے کسی پہلو بارے معذرت خواہ نہیں۔ وہ اس بات کو خاطر میں لائے بغیر کہ آج کی دنیائے دانش میں کون سی بات، سوچ یا رویہ اِن یا آؤٹ آف فیشن ہے، اپنے ذہنی و قلبی احوال کا بلاتامل اظہار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فکرو احساس کے بعض علاقوں سے بدکائے گئے حرف کاروں کی بھیڑ میں گم نہیں ہوا اور اپنی ایک الگ پہچان کے خدوخال اجاگر کرنے کے سفر میں قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ فیشنی بھیڑ اسی لیے وقت کے ساتھ چھٹ جاتی ہے اور دیر تک کسی شمار میں نہیں رہتی کہ اسے فیشنی بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے اپنے اصل انفرادی اور تہذیبی وجود کے ساتھ تکسیری اور تخفیفی سلوک کی سزا

بھگتنا ہوتی ہے۔

نوید ملک کی شعری واردات روح و مادہ اور عقل و وجدان کی ثنویت کے بجائے وحدت پر یقین رکھتی ہے۔وہ ترقیِ شعور و بصیرت کے نتیجے میں اپنے عمیق ایقانات کی ڈوگمائی تعمیر کے انہدام پر مادیتی یک طرفگی کے نشیبوں میں نہیں اترتا، ان کی تعمیرِ نو کرتا چلا جاتا ہے۔اس کا مثالیہ زندگی کے ٹھوس حقائق سے آنکھیں بند نہیں کرتا۔دنیا بھر میں عالمی استعماری قوتوں کی وحشیانہ تاراجی سے لے کر مقامی مقتدر قوتوں کی ریشہ دوانیوں تک سب اس کی نگاہ میں رہتا ہے۔وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ سچی مذہبیت کے مطابق دنیا میں شر کی سرکوبی اور خیر کے غلبے کے لیے ہر لمحے حالتِ جہاد میں رہنا لازم ہے۔اور اس حوالے سے اس کی شعری واردات ایک متحرک اجتماعی سروکار سے ثروت مند ہے۔اس کے موضوعات کے دائرے کی وسعت کے اندازے کے لیے ''ارتعاش'' کی کچھ نظموں کے عنوانات ہی دیکھ لیجیے۔

''سجدے کی قبر میں کچھ لمحات''، ''خدا کے نام ایک خط''، ''خود سے لپٹی ایک کیفیت''، ''واٹ بورڈ''، ''چراغ اگنے کے دن نہیں ہیں''، ''موٹیویشنل کارٹون''، ''وژن''، ''کورونا کی وصیت''، ''سرخ لنگر''، ''امن کے گورے سفیرو بولو''، ''میرا ووٹ آپ کا''، ''ادھورے گاؤں کی پوری لڑکی''، ''ایگریمنٹ''، ''تاجر''، ''لیبر ڈے پر'' وغیرہ

''ارتعاش'' کے فکری و شعری اظہار کے آئینہ دار چند نمونے ملاحظہ فرمائیں

''راجعون''

آدمی کو ستایا گیا
کوئی سقراط ہے جو دھڑکتا ہے سینے میں تو
کچھ موذن نئی چابیاں لے کے
ان کائناتی مداروں پہ ڈالیں گے
قفل خاموش ہیں
اے سراپا محبت خدا!
میں نہ منصور ہوں، --- میں نہ بابا فرید
آپ اپنا ثمر، بے بصر، بے خبر
اے سراپا محبت!
مرے ذہن و دل کے شجر اور آنکھوں کے
آنسو پرندوں پہ
طاری ہیں کچھ وحشتیں
کیا کروں؟

(سجدے کی قبر میں کچھ لمحات)

اگر موذن بشارتوں کے دیے جلائے
ہوا کی آنکھوں میں خون اترتا ہے روشنی میں
یقیں کی مکڑی گمان غاروں پہ کوئی جالا نہیں بناتی
مرے خدایا!
یہ خوف سینوں میں بونے والے
ہماری صبحوں ہماری شاموں میں بے قراری
پرانے والے نہیں بتاتے!
نہیں بتاتے انہیں بتاتے! کہ ذات تیری

رحیم بھی ہے کریم بھی ہے
(خدا کے نام ایک خط)

ہر آگ گلی میں ہے شور اتنا
اذانیں گھر تک پہنچ نہ پائیں
ہماری تہذیب اور روایت مری پڑی ہے
ہر ایک گنبد پہ سرد لہجے جمے ہوئے ہیں
ہے درج ان پر
(یہ لوگ سارے --- جہنمی ہیں)
ہمارے بچے نماز پڑھنے سے ڈر رہے ہیں
نگاہیں سب کی تماش بینوں نے بانٹ لی ہیں
حرا سے آتی ہوئی ہواؤں کو چوزہ دینے کی آرزو میں
بہت سے رستوں نے ڈھول پھونکی
بہت سے گھوڑوں نے جاں گنوا دی

زماں کی گردش
ذرا سنو تو
بہت ہیں طوفاں --- زمیں ہے بنجر
مری صدا کے نحیف شعلے ---- گواہ رہنا
گواہ رہنا
چراغ اگنے کے دن نہیں ہیں
(چراغ اگنے کے دن نہیں ہیں)

فلک تغیرات ہے جب اڑائیں
نگاہوں کو ہمارے پیشوا زنجیرتے ہیں
امامت کے قصیدوں سے ہمارے کان تھکتے ہیں
زبانیں لڑکھڑاتی ہیں
ہمیں جاتے ہوئے دفتر
ٹفن ہاتھوں میں لٹکائے
قدم بجنے کی عادت پڑ گئی ہے
ہمارے زرد بستوں میں
کلرکی جھانکتی ہے
ہمیں لڑنا نہیں آتا
مگر مالِ غنیمت اچھا لگتا ہے
(وژن)

وقت کی آستینوں میں پلتے ہوئے قہقہے
جھاڑ دو
اپنے لب گاڑ دو
آنکھوں میں بکھرتی ہوئی
اپنی بے چہرگی کیلئے ہوئے سائے پر
مسکراہٹ اجالو
نئی صبح تعمیر کرنے کا چارہ کرو
استخارہ کرو
ساری افسردگی اور سراسیمگی
سنسناتے ہوئے
اپنی قسمت سے گھٹ کر گئی
منہدم دائروں میں بدل جائے گی
یہ جو حالات کی دشت آنکھوں سے ہم پر لپکتی ہوئی
لُو ہے کے جائے گی
پیاز چھٹ جائے گی
(اشک تارا کرو)

☆☆☆☆☆

چند بردائی اور مثنوی ''پرتھی راج راسو''

ہندو مذہب کے عام پرچار کے لیے برہمن جس طبقہ کے افراد کو آسان بھجن اور منظومات حفظ کرا کے تبلیغ کا کام لیتے تھے اُنھیں بھاٹ کہا جاتا تھا۔ ابتداً یہ طبقہ اَن پڑھ تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ زبان پر عبور حاصل کر کے تصنیف و تالیف کی منزل تک آ گیا۔ چند بردائی کا شمار بھی اُنھی بھاٹوں میں ہوتا ہے۔ اُن کے والد اجمیر کے راجہ رامیشر کے دربار سے منسلک تھے؛ جب اُن کا انتقال ہو گیا تو پرتھی راج کے عہد میں چند بردائی (۱۱۴۹ء۔۱۲۰۰ء) درباری شاعر کی حیثیت سے تختِ شاہی سے وابستہ ہُوئے اور اپنی ذہانت و فطانت کے بل بوتے پر وزیر کے عہدے تک پہنچے۔

پرتھی راج (حکمرانی: ۱۱۷۷ء۔۱۱۹۲ء) دلّی کے حکمران اننگ پال تومر میو کا نواسا تھا۔ اننگ پال کا دُوسرا نواسہ جے چند گاہڑوال قنوج کا راجہ تھا۔ اننگ پال کی نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے اُس نے پرتھی راج کو گود لے لیا تھا جس کے سبب پرتھی راج کا اثر و رسوخ دلّی تک بڑھ گیا تھا۔ پرتھی راج چونکہ چوہان تھا اس لیے تومر میوں کو دلّی پہ چوہان خاندان کی بالادستی اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس وجہ سے پرتھی راج سے اُن کے اچھے تعلقات استوار نہ ہو سکے اور لڑائیوں تک نوبت آئی جن کا حال چند بردائی نے رقم کیا ہے۔ ''تاریخِ میو'' کے مصنف مہر محمد صالح خاں اطہر کی نظر میں چند بردائی نے پرتھی راج کو جس انداز سے فاتح دکھایا ہے وہ محض افسانہ ہے اور اُن کے مطابق شاعر نے ''دل کھول کر جھوٹ بولا ہے''۔ اپنے بیان میں فاضل مصنف نے بعض تاریخی شواہد کی روشنی میں چند بردائی کی معروضات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیگر محققین نے بھی، جن میں حافظ محمود شیرانی بھی شامل ہیں، چند بردائی کی قصہ گوئی کو زیادہ تر خیال آرائی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پرتھی راج کے حق میں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی

خاور اعجاز

طرف اشارہ کیا ہے جو اِس طویل نظم کے مندرجات پر سوالیہ نشان ہیں۔ اِس کتاب کے مستند یا جعلی ہونے کے بارے میں متعدد علما کی متضاد آرا موجود ہیں تاہم اِس کی قدامت، شاعری اور تاریخی مواد (اگرچہ بہت سا غیر مستند ہے) مِل کر اِس تصنیف کے پرستاروں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں۔ اِسے دیسی زبانوں کی قدیم ترین کتاب کا درجہ بھی حاصل ہے جسے اردو زبان کی تاریخ میں مطبوعہ یا کتابی ماخذ کا نقشِ اول بھی گردانا جا سکتا ہے۔ تاریخی طور پر کئی والیان اِسی سے اپنے اسلاف کی خبر پاتے ہیں۔

چونکہ اِس مضمون کا مقصد ''پرتھی راج راسو'' کی تاریخی غلطیوں کا احاطہ کرنا نہیں اِس لیے اُردو زبان کے ارتقائی سفر میں مذکورہ نظم کی اہمیت کو ہی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ چند بردائی سے پہلے کے شعرا میں کھومان، قطب علی، سائیں دان چارن، فیض اور اکرم کے نام آتے ہیں لیکن چند بردائی کو سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش کے ملغوبے کا پہلا شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔

''پرتھی راج رسا'' کے بعض حصے قواعد کے اعتبار سے درست اور بعض مہمل ہیں۔ اِس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ایک سے زیادہ مصنفین کے تصرف سے ہی ممکن ہو سکتا ہے یعنی یا تو قواعد کے درست استعمال والے حصے چند بردائی کے اپنے تحریر کردہ ہیں یا مہمل والے۔ چونکہ رام چندر شکل (مصنف ''ہندی ساہتیہ کا اتہاس، ص۱۲) کے مطابق ''چند بردائی چھ زبانوں سے واقف تھا (اور) شاعری، عروض، شاستر اور جوتش میں بھی پورا دخل حاصل تھا'' لہٰذا اُس سے ایسے سہو کا امکان نہیں۔ گویا کہ مہمل مندرجات بعد میں آنے والے نسبتاً کم فنی اہلیت کے حامل لوگوں کا اضافہ قرار دیے جا سکتے ہیں جیسا کہ نظم میں ایک جگہ خود چند بردائی نے کہا:

رگھناتھ چرت ہنمت کرت بھوپ بوجھ ادھریہ تھم
پرتھی راج جس کو چند کرت چند نند ادھریہ تھم

....

یعنی جس طرح ہمت کا ''رگھناتھ چرت'' بھوج نے مکمل کیا اُسی طرح چند کے کام کو اُس کے لڑکے پورا کریں گے۔ نظم کی ایک اندرونی شہادت اِس بات کی غماض ہے کہ غزنی روانگی سے قبل چند بردائی نے نظم کا مسودہ اپنے لڑکے جلہن کے حوالے کیا تھا:

پستک جلہن ہتھ دے چل غزن (غزنی) نرپ کاج

....

بعید نہیں کہ جلہن نے اپنے طور پر نظم میں اضافے کیے ہوں۔ چند بردائی کے خاندان کے ایک بزرگ کا بھی یہی خیال ہے کہ چند کے لڑکے نے اضافے کر کے اِسے مکمل کیا اور بعد کے لوگوں نے بھی اِس میں ترمیم و

تنسیخ کی۔مذکورہ نظم میں چند بردائی کے دو تین ہزار کے لگ بھگ اشعار ضرور ہوں گے جنھیں ماہرِ لسانیات شاید انتہائی احتیاط سے تلاش بھی کر سکیں لیکن اس کے پچھلے حصے کو اُس کے بیٹے جہن سے منسوب کرنا اور اکبر کے عہد تک کے لوگوں کا اس میں اضافے کرتے رہنا مکمل متن کو مشکوک بناتا ہے۔دُوسری طرف پنڈت رام چندر شکل کا پرتھی راج کے عہد میں چند بردائی کے وجود کا انکار بھی قابلِ غور امر ہے۔پرتھی راج راسا کے اپنی اصلی حالت میں نہ ہونے کی کئی وجوہات ہیں جیسے:

۱۔ قابلِ لحاظ تعداد میں عربی فارسی الفاظ کا پایا جانا جن کا اُس زمانہ میں امکان نہ تھا۔

۲۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بارے میں غلط معلومات کی موجودگی۔

۳۔ جنگ میں ایسے اسلحہ کا بیان جس کا اُس وقت کوئی تصور نہ تھا، جیسے بندوق۔

۴۔ نظم میں دیے گئے تاریخی شواہد کا غیر مستند ہونا۔

یہاں "پرتھی راج راسا" کے دو ایک نمونے دیے جاتے ہیں جن سے نظم کی زبان سمجھنے میں آسانی ہوگی:

(۱)

جھوٹی ہوے تو سجا لیجیے
سچی ہوے تو جس کیجیے
ہے خاں مل پوچھے بسن
کہوے سیکھ سو کیا کدرتن

بی بی فتے شاہ کی گھرنی
کدرت گور مڈی اک دھرنی
گور مڈی اک چیلک واسن
دیکھ سروپ کوئی روی بھاسن
ہے کھانن مدی گور سدھائے
کر انگری نہی سیکھ دکھائے

....

اِن اشعار میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ غزنی کے شاہ جلال کی ایک حاملہ حرم نے اپنے قتل کے خوف سے غائب ہو کر ایک گور میں پناہ لی۔ پانچ برس بعد جب شاہ جلال کا انتقال ہُوا اور وارثِ تخت کی فکر ہُوئی تو گورستان میں رہنے والے ایک شیخ نے امرائے سلطنت کو فتح بی بی اور اُس کے فرزند کا قصہ سنایا اور کہا کہ اگر جھوٹ نکلے تو سزا اور سچ نکلے تو انعام دیا جائے۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

مرجانا حق ہے
جگ رہے گی گلیاں
سا پرسوں کا جیون
تھوڑا ہی ہے بھلاں

"پرتھی راج راسا" کی عمومی زبان قدیم ترین پراکرت برج بھاشا ہے اور مشکل سے سمجھ آتی ہے تاہم "مرجانا حق ہے" جیسے صاف اُردو مصرعوں کی موجودگی بعد کے تصرف کا واضح ثبوت ہے۔ مثنوی کے مختلف حصوں سے لیے گئے اشعار میں کئی

ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عام قارئین کے لیے آج بھی قابلِ فہم اور تحاریر میں مستعمل ہیں جیسے:

آ (ہ،ا)، آئے (ہ)، اثار (ف،ا)، انگ (ہ،ا)، اناس (پ،ا)، اوپر (ہ)، بار (ہ،ا)، باغبانی (ا)، باگ (ہ -ا)، پاس (ف،ا)، پانی (ہ،ا)، پروردگار (ف،ا)، پلنگ پوش (ف،ا)، پنج (ف،ا)، پوچھ (ہ،ا)، پھول (ہ،ا)، پیٹھ (ہ،ا)، پیر (ف،ا)، پیغمبر (ف،ا)، تسلیم (ع،ا)، تن (ف، ا)، ٹوپی (ہ،ا)، جل (س،ا)، جوگی (ہ،ا)، جہاں تہاں (ہ،ا)، چار (ف، ہ)، چمک (ہ،ا)، حکم (ع،ا)، خان (ت،ا)، دربار (ف،ا)، دشمن (ف،ا)، دکھائے (ہ،ا)، دلیل (ع،ا)، دن (ہ،ا)، دھار (س،ا)، دھرم (س،ا)، دیکھ (ہ،ا)، ڈیرا (ہ،ا) ، رات (ہ،ا)، راج ، ریکھ (ہ،ا)، رنگ (ف،ا)، روپ (س،ا)، روشن (ف،ا)، زیور (ع،ا)، سارا (ہ،ا)، سائیں (ہ،ا)، سجن (س،ا)، سچی (ہ،ا)، سلام (ع،ا)، سنگ (ف،ا) ، سیپارہ (ف،ا)، سیکھ (ہ،ا)، سینتیس (ہ،ا)، شیخ (ع،ا)، صاحب (ع،ا)، فرنگی (ف،ا)، فریاد (ف،ا)، فقیر (ع،ا)، فوج (ع،ا)، قرآن (ع، ا)، کاج (ہ،ا)، کٹھن (س،ا)، ژ کرامات (ع،ا)، کرم (ع،ا)، کوچ (ف،ا)، کوچہ (ف،ا)، کوہکن (ف،ا)، کھائی (ہ،ا)، کھیت (ہ،ا)، گاہے (ف،ا)، گمان (ف،ا)، گھر (ہ،ا)، محمد (ع،ا)، مسلمان (ف،ا)، مشتر (ہ،ا)، موت (ع،ا) نیت (ع،ا)، ہڈی (ہ،ا)، ہندو (ف،ا) اشاریہ: ا (اردو) پ (پرتگالی)، ت (ترکی)، س (سنسکرت)، ف (فارسی)، ع (عربی)، ہ (ہندی)

یہ کل ۹۷ الفاظ ہیں جن میں سے ۳۲ ہندی، ۲۴ فارسی، ۱۵ عربی، ۹ سنسکرت اور ایک ایک ترکی اور پرتگالی ہے۔ بعض الفاظ کا تلفظ قدیم ہے جیسے: اکھوٹ (اخروٹ)، بخت (وقت)، بندوک (بندوق)، پاتساہ (پادشاہ)، پکوری (پکوڑی)، تکھت (تخت)، جنانہ (زنانہ)، راجی (راضی)، ساہ کھوسان (شاہ خورسان)، ستوت (شہتوت)، سرم (شرم)، سہاب دین گوری سرتان (شہاب الدین غوری سلطان)، سیو (سیب)، کھرما (خرما)، کھلک (خلق)، کھندھار (قندھار)، گاجی (غازی)، جنھیں (درج بالا بحث اور شواہد یہ اظہار کرتے ہیں کہ یہ مثنوی ۱۱۹۲ء کے بعد (غالباً اوائل تیرھویں صدی عیسوی میں) لکھی گئی اور اس میں عہدِ اکبری (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) یعنی سولھویں صدی کے وسط سے سترھویں صدی کے اوائل تک ترامیم، اضافے اور الحاقی اشعار داخل ہوتے رہے۔

☆☆☆☆☆

ادب ادیب اور اسلام عظمی [1961 سے شروع ہونے والا ادبی سفرنامہ] (قسط سوم)

غلام محمد قاصر کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خاں سے تھا مگر وہ حلقہ ارباب غالب میں اکثر دیکھا جاتا۔ دیکھنے میں کم گو مگر شعر بولتے ہوئے۔ اس کے بہت سے شعر ایک بار سننے پر یاد ہو جاتے۔ اس کا شعری مجموعہ تسلسل شائع ہوا تو ایک نسخہ مجھے بھی عنایت کیا۔ ایک شعر دیکھیے۔

بیکار گیا سونا صدیوں مرا غاروں میں
اس شہر میں تو اب تک سکہ بھی نہیں بدلا

....

ہو سکتا ہے کہ پہلے مصرعے میں غاروں کی جگہ کوئی اور لفظ ہو۔ مجھے اپنی یادداشت پر بھروسا ہے مگر وقت کی دیمک بہت کچھ کھا جاتی ہے۔

کسی نے بتایا کہ غلام محمد قاصر ایک روز "فنون" کے انارکلی والے دفتر میں بیٹھا تھا۔ دن گرمیوں کے تھے۔ کمرے کی کھڑکی مغرب کی طرف کھلتی تھی - دن ڈھلا تو دھوپ غلام محمد قاصر سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک تو یہ چھیڑ چھاڑ برداشت کرتا رہا پھر تلملا کر اس تیزی سے کھڑکی کی طرف لپکا کہ احمد ندیم قاسمی بولے۔

قاصر سورج کو کچھ نہ کہنا۔

جملہ فی البدیہہ تھا قہقہے گونجنے لگے کیوں نہ گونجتے، لہجہ بے ساختگی اور برجستگی کمال کی تھی۔ اخبار امروز کے کالم حرف وحکایت میں قاسمی صاحب کے قلم کا یہ جادو سر چڑھ کر بولتا۔

کافی لوگوں سے جان پہچان ہو جانے کے باوجود فنون کے دفتر میں میری کبھی کبھار کی حاضری ایک آؤٹ سائیڈر جیسی ہوتی۔ ضیا بٹ نے حلقے کے ایک اجلاس میں بھاری پانی کے عنوان سے ایک خوب صورت افسانہ پڑھا

اسلام عظمی

تھا جس کی اٹھتے بیٹھتے خوب پذیرائی ہوتی۔
حلقے کے اجلاس میں رفیق اظہر بھی آتے۔
رفیق اظہر کا تعلق چونیاں سے تھا اور وہ چونیاں کے میرے دفتری کولیگ عبدالستار کا قریبی دوست تھا۔ حبیب بینک میں ہونے کی وجہ سے وہ شاہد شیدائی کا شناسا تھا۔ رفیق اظہر حلقے کے اجلاس میں چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ میں نے حسین مجروح کے شعری مجموعے کشید کے حوالے سے جو مضمون لکھا اس میں یہ سطریں لکھیں۔
رفیق اظہر ہر کسی کا شعر سن تو لیتا مگر میر تقی میر، فراق گورکھپوری اور ناصر کاظمی کے علاوہ کسی اور کو شاعر نہ مانتا۔ جس طرح عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، بندہ شاعر ہو تو شاعری بھی چھپائے نہیں چھپتی۔
اس کے چھپانے پر بھی دوستوں کو پتا چل گیا کہ رفیق اظہر کراچی جا کر اور کاموں کے علاوہ شاعری بھی کرتا ہے۔ اپنا رنگ کسے مرغوب نہیں ہوتا رفیق اظہر نے اپنے شعری مجموعہ برگ تازہ کی اشاعت کے بعد خود کو چوتھا شاعر مان لیا۔
رفیق اظہر کا یہ شعر دیکھ لیں۔

چلتے چلتے چھلک جائیں
ان چھکے دودھ کے بھرے برتن

....

اور یہاں حسین مجروح کا یہ شعر پڑھ لیں:

جھولا پڑا نہ چھاؤں میں بیٹھا کوئی فقیر
شیشم کا پیڑ شہر میں بے آبرو ہوا

....

لگے ہاتھوں غلام محمد قاصر کا یہ شعر بھی پڑھ لیں۔۔

تم یونہی ناراض ہوئے ہو ورنہ میخانے کا پتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

وہ ایک بھرپور شاعر تھا مگر وقت سے پہلے ہی محفل چھوڑ گیا۔ مگر اس کی یاد اب بھی اہلِ دل کے ساتھ ہے۔
شاہد شیدائی تب حبیب بینک کی نیلا گنبد والی برانچ میں تھا۔ وہیں قیوم نظر کا بیٹا سلمان بٹ بھی۔ وہاں سارا دن بینک میں لکھاریوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ایک روز شاہد شیدائی سے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ ریڈیو ٹی وی کے چیک کیش کروانے آتے ہیں عمومی طور پر تو قائم نقوی نے مجھے درجنوں لوگوں سے متعارف کروایا مگر شاہد شیدائی اور سلمان بٹ کے پاس بھی بہت سے لکھنے والوں سے ملا۔
شاہد شیدائی اپنے مزاج کا بندہ ہے۔ ایک روز کہا کہ سگریٹ ختم ہو گئے ہیں۔ چلو مولا بخش پان والے سے لے آئیں۔ اتنی دور سے کیوں، پاک ٹی ہاؤس کے ساتھ سگریٹ کی دکان ہے، یہیں سے لے

لیں--- اتنا دور کس لیے جانا ہے---
وہاں سے تازہ سگریٹ ملتے ہیں۔
مجھے حیرت ہوئی--- کیا سگریٹ بھی تازہ اور باسی ہوتے ہیں--- میں نے پوچھا۔
بالکل ہوتے ہیں۔ تم سگریٹ نہیں پیتے اس لیے نہیں جانتے۔ سگریٹ کی ڈبی کی سائیڈ کھولیں تو وہاں ایک نمبر درج ہوتا ہے۔ نمبر سے پتا چل جاتا ہے۔
اتنی باریکی میں جانا شاہد شیدائی کو ہی سجتا تھا۔ شاہد شیدائی ان دنوں اخبار امروز کے لیے روبرو کے عنوان سے لکھاریوں کے انٹرویو کر رہا تھا۔ رات کے کوئی نو بجے تھے۔
احسان دانش کا انٹرویو کر آئیں۔ سکوٹر وغیرہ وہیں چھوڑ کر شاہد شیدائی شفیق سلیمی اور میں پیدل انارکلی چل دیے۔ انٹرویو کے بعد ہم غزلو غزلی ہونا بھی ضروری تھا۔ رات کے دو بج گئے۔ شفیق سلیمی نے کہا۔
چلنا چاہیے۔ پاک ٹی ہاؤس بند ہو گیا ہوگا۔ میرا اسکوٹر کوئی لے نہ جائے۔
فکر مت کرو۔ پاک ٹی ہاؤس بند نہیں ہوا ہو گا۔ وہ لوگ ہمیں پاک ٹی ہاؤس کے اندر ڈھونڈ رہے ہوں گے۔
آج کے دور میں یہ باتیں کہاں---
چاند راتوں میں لوگ گھومتے۔ تبھی تو ناصر کاظمی یہ شعر کہتا---

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

....

دل کو چھو لینے والی شاعری ڈرائنگ روموں کی دین تھوڑی ہوتی ہے۔
ایک روز ہم جمگھٹے کی شکل میں پاک ٹی ہاؤس سے نکلے۔ شفیق سلیمی، غلام محمد قاصر، انعام الحق جاوید ساتھ تھے۔ دروغہ والا، شاہد شیدائی ساہو واڑی، انعام الحق جاوید مغل پورہ اور میں نبی پورہ لال پل میں رہتا تھا۔
اچانک یہ پروگرام بن گیا کہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے والی گراؤنڈ میں بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔ وہاں بیٹھ کر کچھ گپ شپ ہوئی کچھ غزلوں غزلی--- رات کے ایک بج گئے تو انعام الحق جاوید نے محفل ختم کرنے کا کہا کہ وہ اور لیٹ ہو گیا تو اس کے کمرے کے ساتھی دروازہ۔ ہیں کھولیں گے۔
شفیق سلیمی اس روز سکوٹر پر نہیں آیا تھا اور اس نے دروغہ والا شاہد شیدائی کے ساتھ جانا تھا۔ شاہد شیدائی نے شفیق سلیمی کو ہونڈا پر بٹھایا اور چل دیا۔
اگلے روز شفیق سلیمی کا فون آیا۔ کل رات تو کمال ہو گیا۔ میرے گھر پہنچتے ہی شاہد شیدائی نے کچھ کھانے کو مانگا۔ میری بیوی اس روز میکے میں کسی تقریب میں تھی۔ میں کچھ گھبرایا

کر کے آیا تو شاہد شیدائی صوفے پر بیٹھے سو رہا تھا۔ جگایا تو نہیں جاگا۔ میں دوسرے صوفے پر سو گیا۔ فجر کی اذان ہوئی تو انھوں نے مجھے جن جھنجھوڑا۔ ۔ ۔ ۔میں کہاں ہوں۔۔ میرے گھر پر۔۔ وہ کیوں۔۔۔۔ اس لیے کہ آپ میرے کھانا لانے تک سو چکے تھے۔۔ جگایا کیوں نہیں۔۔ بہت جگایا تھا آپ ہی جاگے نہیں۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ آدمی کہیں بھی رات گزارے جاگنا اپنے بستر ہی سے چاہیے۔۔۔ جب پھر ملاقات ہوئی تو پوچھا۔۔۔ بجی سے کیا تھا بہانہ کیا۔۔ ابن انشا نے شاید ایسی ہی کسی صورت حال کے لیے کہا۔ بجی سے کروگے بہانہ۔۔۔

شاعر بھی اسی دنیا کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ کوئی یہ بات نہیں مانتا تو اس کی مرضی۔ بے کار کے مباحثے سے بچنے کے لیے شاہد شیدائی کو کسی کی موت کا بہانہ بنانا پڑا۔ عمر کے ایک حصے میں چھوٹے چھوٹے جھوٹ مزہ دیتے ہیں۔ کچھ پہلے سلمان بٹ کی بات ہوئی تھی۔ یاروں کا یار تھا۔ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھو بوریت ہوتی ہی نہ تھی۔ غلام محمد قاصر اور شفیق سلیمی اب اس دنیا میں نہیں۔ انعام الحق جاوید جنتری کو پیارا ہو چکا۔ میں نے پردیس میں عمر گزار دی۔ شاہد شیدائی نظر کی کمزوری کی وجہ سے گوشہ نشین ہے اور میں سماعت کے ہاتھوں مجبور۔ یہی تو ہے زندگی۔ شہر اتنا پھیل گیا ہے کہ ہر کوئی اپنے اپنے زندان کا قیدی بن چکا ہے۔ آنے والا وقت جانے کیسا ہوگا۔

پردیس میں میری ڈیوٹی میں پراجیکٹ پر استعمال ہونے والے مواد کی فیکٹریوں کا معاینہ کرنا بھی شامل تھا۔ اس بہانے متحدہ عرب امارات کے بھی شہروں میں گھومتا رہتا۔

کوئی بیس سال پہلے

پایپ بنانے والی ایک فیکٹری میں گیا تو بتایا گیا کہ آج پروڈکشن پیچھے سے بند ہے۔

پیچھے سے مطلب۔۔۔

جرمنی سے۔

مجھے کچھ حیرانی ہوئی۔۔۔

فیکٹری متحدہ امارات میں اور کنٹرول جرمنی سے

منیجر نے بتایا کہ ہماری فیکٹری پروڈکشن کے حساب سے جرمنی کی مدد کمپنی کو ٹیکس یا بھتہ دیتی ہے۔ بل وقت پر ادا نہ ہو تو ریموٹ سے جرمنی ہی سے پروڈکشن بند۔ تب یہ بات عجیب لگی تھی۔ اب یہ معمول کی بات ہے۔۔ ہر شعبے میں ٹیکنالوجی راج کرنے لگی ہے ۔ مصنوعی ذہانت ممکن ہے کہ شاعری بھی کرنے لگے۔۔ پیسا پھینکو اور تماشا دیکھو کا دور آ چکا ہے۔۔۔ بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں۔۔ تک محدود ہے۔

[جاری ہے۔]

الحمرا ادبی بیٹھک کی یادیں

آج میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یادوں کا ایک ریلا اپنے تعاقب میں آتا دکھائی دیتا ہے۔ ان یادوں میں بہت سی یادیں الحمراء ادبی بیٹھک سے جڑی ہوئی ہیں جو کم و بیش پندرہ بیس برس کے عرصے پر محیط ہیں۔

لاہور آرٹس کونسل (الحمراء) لاہور کیا پاکستان کی ثقافت اور ادب کا ایک بہت بڑا ادارہ ہے جو نا صرف فنکاروں بلکہ شاعروں ادیبوں کی ترویج و ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسی ادارے کے ایک خوب صورت ہال کو جب ادبی بیٹھک کا نام دیا گیا تو شہر بھر کے شاعروں ادیبوں کو یہاں بیٹھنے کا ایک مستقل ٹھکانہ مل گیا۔ کیوں کہ اس عرصہ میں ان کا واحد ٹھکانہ پاک ٹی ہاؤس بندش کا شکار تھا اور شاعر ادیب دربدر ہو چکے تھے۔ وہ ہوٹلوں اور چائے خانوں میں ملاقاتیں کرتے اور وہیں تبادلہ خیال کر لیتے مگر وہ ان وقتی ٹھکانوں سے مطمئن نہ تھے۔

غالباً ۲۰۰۴ء میں پنجاب کے گورنر خالد مقبول نے الحمراء ادبی بیٹھک کا افتتاح کیا اور اسے ادبی سرگرمیوں کے لیے کھول دیا گیا۔ اُس وقت الحمرا کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر اصغر علی گیلانی تھے جو کہ ادب نواز شخص تھے۔ ادبی بیٹھک کے اندر ہی ایک چائے خانہ بھی بنا دیا گیا تاکہ یہاں آ کر بیٹھنے والے چائے کی کمی محسوس نہ کریں۔ شام ۴ بجے سے دس بجے تک اس کے اوقات کار تھے۔ شاعر ادیب ۴ بجے ہی یہاں پہنچنا شروع ہو جاتے اور اپنے دوستوں کے ساتھ نشست کرتے۔ یہ بتاتا چلوں کہ ادبی بیٹھک صرف شاعروں ادیبوں کے بیٹھنے کے لیے مختص کی گئی تھی اور ہفتے میں چند روز یہاں مشاعرے یا دیگر ادبی تقریبات بھی منعقد کروائی جاتی تھیں۔ بعد ازاں یہاں صحافی اور فنکار بھی آ کر بیٹھنا شروع ہو گئے۔ اس کا ایک داخلہ کارڈ بھی بنایا جاتا تھا جو اکثر شاعروں ادیبوں نے بنوا لیا تھا اور سفارش کے ذریعے صحافی وغیرہ بھی بنوا لیتے تھے۔ جب میں پہلی بار ادبی بیٹھک گیا تو میرا کارڈ نہیں بنا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ نے مجھے دروازے پر روک لیا اور کارڈ طلب کیا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بیٹھک کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ سامنے دائیں طرف ستون کے ساتھ والی میز پر ڈاکٹر یونس جاوید، ڈاکٹر کنول فیروز اور ناصر زیدی

آفتاب خان

بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر یونس جاوید نے مجھے دیکھ لیا اور گارڈ سے کہا "انھیں آنے دو" یوں میں ادبی بیٹھک میں داخل ہوا۔ یہ غالباً ۲۰۰۸ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر یونس جاوید نے مجھے بیٹھنے کا کہا اور ساتھ ہی بولے "کل اپنی دو تصویریں اور شناختی کارڈ کی کاپی لے آئیں میں کارڈ بنوا دوں گا۔" وہ مجھے کچھ عرصے پہلے سے جانتے تھے۔ اظہر جاوید کے ماہنامہ "تخلیق" کے دفتر میں ان سے دو تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور انھیں علم تھا کہ میں شاعر ہوں۔ اس طرح ڈاکٹر کنول فیروز سے بھی وہیں ملاقاتیں ہوئیں اور وہ بھی مجھے جانتے تھے۔ ڈاکٹر یونس جاوید اُس وقت الحمرا کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر تھے۔ اگلے چند روز میں میرا کارڈ بنوا کر یونس جاوید صاحب نے مجھے دے دیا اور یوں میں بیٹھک کا ممبر بن گیا۔ کارڈ بنوانے کے لیے دو ممبرز کی تصدیق اور دستخط کرنے پڑتے تھے۔ میرے فارم پر ڈاکٹر یونس جاوید اور ڈاکٹر کنول فیروز نے دستخط کیے تھے۔ بعد میں ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ آنے والے ہر نئے شاعر ادیب کے فارم پر اس ناچیز کے دستخط ہوئے۔ اس طرح قریباً پچاس فارمز پر دستخط کیے اور حقیقی شاعروں کو ممبر بنانے کا راستہ بھی دکھایا ان کے فارم بھی پُر کیے۔

کارڈ بننے کے بعد کچھ عرصہ تک میں تسلسل سے ادبی بیٹھک نہیں جاتا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار چلا جاتا یا کوئی تقریب ہوتی تو اُس میں شرکت کے لیے جانا پڑتا۔ مجھے بیٹھک کی طرف مکمل طور پر مائل کرنے میں (مرحوم) دوست مقصود عامر کا بہت ہاتھ ہے۔ وہ چند دوستوں کو اکٹھا کر کے بیٹھک لے آتا۔ جن میں رضا عباس رضا، شہزاد تابش، وغیرہ شامل تھے۔ بعد میں اس گروپ میں زاہد شمسی اور جاوید قاسم بھی شامل ہو گئے۔ اور ہم سب ایک ہی میز پر بیٹھنے لگے۔ اس دوران بیٹھک میں بیٹھنے والے دیگر شاعروں ادیبوں سے بھی میری ملاقات اور بات چیت ہونے لگی۔ بہت سے شاعر تو ایسے تھے جن سے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

بیٹھک میں بلا ناغہ آنے والوں میں رفیق غوری اور خالد احمد سر فہرست تھے۔ رفیق غوری شاعر ادیب نہیں صحافی اور کالم نگار تھے۔ وہ چار بجتے ہی ادبی بیٹھک پہنچ جاتے بلکہ بعض اوقات گارڈ کو ڈھونڈ کر بیٹھک کا دروازہ کھلواتے ادبی بیٹھک میں ان کی ایک نشست سگریٹ کارنر والے حصے میں مخصوص تھی جہاں تشریف رکھتے ہی وہ اپنا پائپ سلگا لیتے اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرتے جاتے۔ اتنی دیر میں کینٹین والے لیاقت صاحب بھی آ جاتے۔ وہ آتے ہی غوری صاحب کے سامنے پانی کا گلاس اور راکھ دان رکھ دیتے اور غوری صاحب انھیں چائے کا آرڈر دے دیتے۔ غوری صاحب کی یہ خاصیت تھی کہ وہ ہر آنے والے کو چائے پلاتے۔ جو نہ پیتا اُسے زبردستی پلا دیتے تھے۔ وہ خود بھی بیٹھے بیٹھے کئی کپ چائے کے پی جاتے۔

خالد احمد بھی دفتر سے چھٹی ہوتے ہی سوا چار بجے تک ادبی بیٹھک پہنچ جاتے۔ ان کے آتے بھی چائے کے دور شروع ہو جاتا۔ وہ چوں کہ چین سموکر تھے اس لیے ان کی نشست بھی سگریٹ کارنر والی

جگہ پر تھی۔ جہاں پہلے سے رفیق غوری براجمان ہوتے اور ان دونوں کی آپس میں نوک جھونک چلتی رہتی۔ خالد احمد کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کے پاس لاہور کے شاعر ادیب بھی آ کر بیٹھتے اور دوسرے شہروں سے آنے والے نوجوان بھی انھیں ملنے لازماً ادبی بیٹھک آتے۔ خالد احمد کے شاگرد بھی کافی تھے۔ کچھ ان سے اصلاح لینے بھی آتے جبکہ ان کے ہم عصر بھی ان کی مجلس کا حصہ ہوتے۔ ایک طویل فہرست ہے ان کی محفل میں بیٹھنے والوں کی۔ کچھ نام حاضر ہیں۔ راقم کے علاوہ نجیب احمد، ایم آر شاہد، احمد عقیل روبی، اعجاز رضوی، اعجاز کنور راجہ، قائم نقوی، شفیق سلیمی، عباس تابش، واجد امیر، عباس نجمی، ایوب خاور، محمد ایوب، رضی الدین رضی، اعجاز فیروز فیروز، لطیف ساحل، ارشد شاہین، منصور فائز، عقیل اختر، اظہر حسین، زعیم الرشید، عون الحسن غازی نواز کھرل، عابد خان، آصف نظیر، کامران نذیر، اسرار چشتی، جمشید چشتی، منظر علی اختر، زاہد ہما شاہ، سرور حسین نقشبندی، کامران ناشط، سلیم طاہر، اعزاز احمد آذر، افتخار مجاز وغیرہ۔ اس فہرست کو مکمل نہیں کہا جاسکتا ہے۔ بہت سے نام اگلی سطور میں بھی آئیں گے۔

یہ ادبی بیٹھک کے قیام کے کچھ عرصہ بعد کی صورت حال ہے غالباً دو ہزار پانچ، چھ کا زمانہ تھا۔ اُس وقت ادبی بیٹھک میں جو تقاریب ہوتی تھیں ان کی اجازت خالد احمد سے لینا پڑتی۔ انھوں نے ایک کاپی رکھی ہوئی تھی جس میں تقاریب کی تاریخیں درج ہوتی تھیں۔ اُسی زمانے میں خالد احمد اپنے رسالے "بیاض" اور ادبی تنظیم "بیاض" کے تحت ماہانہ طرحی مشاعرہ منعقد کرواتے تھے۔ اس وقت سوشل میڈیا کا دور نہیں تھا۔ صرف ایس ایم ایس ہوتا تھا اس کے ذریعے "طرحی مصرع" دے دیا جاتا اور اگلے ماہ ادبی بیٹھک میں طرحی مشاعرہ منعقد کیا جاتا۔ اکثر ان مشاعروں کی نظامت خالد احمد خود کرتے۔ مشاعرہ کا وقت پانچ بجے کا ہوتا۔ پانچ بجتے ہی خالد احمد مائیک پر آ جاتے اور کہتے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اس طرح چاہے تین افراد ہی موجود ہوتے وہ مشاعرہ شروع کر دیتے۔ دو تین ماہ ایسا کرنے سے لوگ وقت پر آنا شروع ہو گئے۔ ان مشاعروں میں لاہور کے سبھی اہم شاعر شرکت کرتے۔ راقم نے بھی کئی طرحی مشاعرے پڑھے۔ اعجاز رضوی اور ارشد شاہین بھی ان مشاعروں کی نظامت کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ ادبی بیٹھک میں مختلف ادوار میں مختلف شاعر ادیب آتے رہے کچھ الگ الگ اور کچھ گروپ کی صورت میں۔ جیسے ڈاکٹر غافر شہزاد، فرحت عباس شاہ، شفیق احمد خان اور شاہدہ دلاور شاہ کا ایک گروپ تھا۔ زاہد مسعود، امجد طفیل، زاہد حسن، ملک شہزاد اور زاہدہ راؤ کا ایک الگ گروہ تھا۔ کچھ شاعر ادیب بیرونی ممالک سے مستقل طور پر پاکستان آئے تو ان کا ایک الگ گروپ بھی تھا۔ جیسے شفیق سلیمی، اسلام عظمی، ممتاز راشد لاہوری اور رفیق اظہر وغیرہ ان کے ساتھ قائم نقوی بھی بیٹھ جاتے اور اکثر میں بھی ان کی میز پر موجود ہوتا۔

اچھا ایسا نہیں تھا کہ یہ کوئی مستقل گروپ تھے اور کسی اور کو آگے آنے نہیں دیتے تھے بلکہ سب کا آپس

میں گہرا تعلق تھا اور وہ ایک دوسرے کی میز پر آتے جاتے تھے۔ بعض اوقات سارے ہی لوگ ایک جگہ کرسیاں اکٹھی کر لیتے اور پندرہ بیس افراد ایک ہی جگہ بیٹھ کر شعروادب یا ملکی حالات کے حوالے سے گفتگو کرتے۔ جس میں بعض دفعہ گرما گرمی بھی ہو جاتی لیکن بہرحال سب کے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور احترام موجود تھا۔ اس وقت ادبی بیٹھک میں ایک ٹی وی بھی ہوتا تھا اور سردیوں میں دو ہیٹر بھی چلتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادبی بیٹھک کے ممبران میں اضافہ ہوتا رہتا۔ حسین مجروح، کامریڈ شفیق احمد شفیق، آفتاب جاوید، سیّد سرفراز حسینی، جاوید آفتاب، علی اصغر عباس، انیس احمد، حکیم سلیم اختر ملک، تاثیر نقوی، ناصر رضوی، وحید ناز، دُرِ نجف زیبی، طیوش فردوس، ساجد یزدانی، خالد نصر، محمد سجاد، عزیز شیخ، عبدالحفیظ ظفر، ارشد نسیم بٹ، عامر فراز، اقبال کیفی، محمد پرویز کلیم، ساجد حسین ساجد، عرفان ہاشمی، حماد نیازی، احمد عطا اللہ، جمیل خان، درخشندہ نوید، فاطمہ غزل، کوثر ایمن، فوزیہ اعوان، کنور عبدالماجد، اثر اسلم، نجمہ شاہین، پروین سجل، رخسانہ نور، آسناتھ کنول، تسنیم کوثر، سیمی شاہ، افضال عاجز، ڈاکٹر ایوب ندیم، نون عین صابر، ناصر جالب، فیضان رشید، طاہر بن شہزاد وغیرہ بھی شامل تھے۔

الحمرا ادبی بیٹھک میں ادبی شخصیات کے علاوہ ثقافتی شخصیات کا اُٹھنا بیٹھنا بھی ہوتا تھا۔ گلوکار ارشد علی، گلوکار عنایت عابد، اسحاق حیدر، اداکار امان اللہ، قوی خان، مسعود اختر، حسیب پاشا، راشد محمود، عرفان کھوسٹ، اسد نذیر، شکیل چاند اور دیگر بہت سے فنکار یہاں آ کر وقت گزارتے۔ سٹیج ڈرامہ رائٹر منیر راج نے یہاں ایک مستقل ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ اداکار زیادہ تر ان کے پاس ہی آتے البتہ گلوکاروں کا تعلق شاعروں سے تھا۔ وہ اُن کی غزلیں گاتے تھے۔ خاص طور پر گلوکار عنایت عابد بعض تقریبات میں کسی نہ کسی شاعر کی غزل گا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض شاعروں کی غزلیں باقاعدہ دُھن کے ساتھ تیار کر رکھی تھیں۔ خالد احمد کی غزل "بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے" کی طرز اور گائیکی لوگوں کو مبہوت کر دیتی تھی۔ اس طرح عنایت عابد نے میرے علاوہ ڈاکٹر ایوب ندیم، افضال عاجز، کامران نذیر کی غزلیں بھی تیار کیں اور اس کے لیے ادبی بیٹھک ہی میں سازندوں کے ساتھ یہ غزلیں ایک تقریب میں پیش کی گئیں۔ عنایت عابد نے ریڈیو اور ٹی وی پر بہت سے شاعروں کا کلام گا رکھا تھا۔ آخری بار انھوں نے ڈاکٹر ایم ابرار کی تین غزلیں ہال نمبر ۳ کی ایک تقریب میں گائی تھیں۔ اس کے چند روز بعد وہ وفات پا گئے۔ یہاں ایک بات کا اضافہ کر دوں کہ ۲۰۱۸ء سے پہلے ادبی بیٹھک میں ادبی پروگراموں کے علاوہ موسیقی کے پروگرام کرنے کی بھی اجازت تھی۔ اس ناچیز نے بھی چند دوستوں کے ساتھ مل کر موسیقی کے کچھ پروگرام کروائے۔ ان کی نظامت بھی کی۔ بعض دوسرے لوگوں کے پروگراموں کی نظامت کرنے کا موقع بھی ملا۔ یہ پروگرام باقاعدہ سازوں اور سازندوں کے ساتھ منعقد کیے جاتے تھے اور ان میں بڑے بڑے گلوکار آ کر گاتے۔ ادبی بیٹھک سے ایک رائٹر شفقت شاہ

کا بھی بہت ہی تعلق رہا۔ وہ جہاں ادبی تقریبات کراتے وہاں موسیقی کے بھی بہت بڑے بڑے پروگرام منعقد کرواتے۔ ادبی بیٹھک کے قیام کے بعد اس کے ابتدائی چودہ سال انتہائی عروج کے تھے۔ ہفتہ میں تین چار دن ادبی تقریبات ہوتی تھیں جن میں لاہور کی تمام سرکردہ ادبی شخصیات شرکت کرتی تھیں۔ ان کا ذکر کسی الگ مضمون میں موجود ہے۔ جب موسیقی کے پروگرام ہوتے تو بیٹھک میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ ہوتی تھی۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''تم اچھے وقت کے انتظار میں ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے جو وقت گزر گیا وہی اچھا ہو۔'' واقعی ادبی بیٹھک میں جو زمانہ گزرا ہے وہی سب سے اچھا تھا۔ جن شاعروں ادیبوں کو یہاں آ کر بیٹھنے کا چسکہ پڑ چکا تھا وہ شام ہوتے ہی ادبی بیٹھک کا رُخ کرتے اور مختلف دوستوں سے تبادلۂ خیال کرتے۔ میں بھی چار بجے دفتر سے چھٹی کرتے ہی سیدھا ادبی بیٹھک پہنچ جاتا۔ وہاں اور کوئی نہیں تو ڈاکٹر کنول فیروز سب سے پہلے آئے ہوتے تھے۔

یہ چسکا ایسا تھا کہ ایک بار عید کے دن بھی میں اور کامران نذیر ادبی بیٹھک پہنچ گئے اور گارڈ کو کہہ کر بیٹھک کھلوا کر بیٹھ گئے پھر چند اور دوست بھی آ گئے اور چائے والے کو بھی فون کر کے بلوا لیا۔ بلاشبہ یہ بیٹھک سے محبت تھی اور دوستوں کی ایسی قربت تھی کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔

مختلف ادوار میں ادبی بیٹھک میں بیٹھنے والوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کچھ لوگ آنا جانا چھوڑ دیتے ان کی جگہ نئے اور لوگ آ جاتے۔ ایک وقت میں کارڈ کی پابندی میں نرمی کر دی گئی جس کی وجہ سے بہت سے غیر ادبی لوگ بھی بیٹھک میں آنے لگے اور ہم نے انتظامیہ سے کہہ کر نئے لوگوں کے لیے کارڈ کی پابندی لگوائی اور کچھ حقیقی شاعروں ادیبوں کے کارڈز بنوائے۔

اب مجھے تاریخیں یا سال ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ کس نے کب ادبی بیٹھک میں قدم رکھا مگر اب بھی بہت سے نام ایسے ہیں جن کا وہاں بیٹھنا لازمی تھا۔ مثلاً خالد نقاش، ڈاکٹر ایم ابرار، اقبال راہی، ذاکر خواجہ، شبنم مرزا، ڈاکٹر جواز جعفری، عرفان صادق، راجا نیئر، ناصر بشیر، ڈاکٹر اختر شمار، میاں افتخار اعجاز، ڈاکٹر عنصر پرویز، ارشد چودھری، اعتبار ساجد، ڈاکٹر اجمل نیازی، سعد اللہ شاہ، کرامت بخاری، قاری صادق جمیل، حسن بانو خان، ریاض رومانی، باقی احمد پوری، فراست بخاری، جاوید رضی، عینی راز، مسعود تنہا، منور سلطانہ بٹ، در نجف زیبی، وسیم عباس، کاظم جعفری، اقبال بخاری، صغرا صدف، سلطان محمود، حسن عباسی، عبدالمجید چٹھہ، طارق چغتائی، احمد سبحانی آکاش، نیلما ناہید درانی، صوفیہ بیدار، یاسمین بخاری، ثمینہ سید، جاوید شیدا، سفینہ سلیم، خلش بجنوری، احسان اللہ ثاقب، اشرف سلیم، ملیحہ سید، نوید مرزا، ابرار حامد، وحید احمد زمان، کنور امتیاز احمد، نوید صادق، سرفراز سید، ڈاکٹر سعادت سعید، زاہد مبارک ڈار، طفیل اختر دادا، رشی خان، سرور سکھیرا، امیر علی جعفری، حبیب اللہ نیازی، ڈاکٹر عبدالستار، ریاض صحافی، رشید مصباح، پروفیسر مشکور صدیقی، ملک طارق محمود، عاطف ملک، علامہ بشیر رزمی، شہزاد احمد، ڈاکٹر اخلاق گیلانی، ابصار عبدالعلی، محمود الحسن گیلانی، طارق چغتائی، شیراز انجم، ریاض احمد

جسٹس، عارف چودھری، آصف علی بادل، مرغوب حسین نقوی، راجہ ریاض خان وغیرہ وغیرہ۔ عین ممکن ہے ان میں سے بہت سے نام یاد سے محو ہو کر لکھنے میں نہ آسکے ہوں مگر یہ وہ ادبی لوگ تھے جو تقریبات کے علاوہ ادبی بیٹھک میں روزانہ کی بنیاد پر آکر بیٹھتے اور دوستوں سے تبادلہ خیال کرتے تھے جبکہ ان کے علاوہ بہت سے سینئر یا جونیئر افراد ایسے تھے جو صرف تقریبات میں شامل ہونے کے لیے ادبی بیٹھک میں قدم رنجہ فرماتے۔

غالباً ۲۰۱۵ء میں کیپٹن عطا محمد خان نے جب الحمراء کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھالا تو شاعر ہونے کے ناطے انھوں نے شاعروں سے اپنا تعلق استوار رکھا اور کبھی کبھار شام کے وقت ادبی بیٹھک میں آکر بیٹھ جاتے اور شاعروں سے گفتگو کرتے اور ادبی بیٹھک کی بہتری کے حوالے سے تجاویز بھی طلب کرتے مگر یہی عطا محمد خان تھے جنھوں نے دوسروں کی باتوں میں آکر ادبی بیٹھک بند کر دی۔ شاید یہ ۲۰۱۷ء کی بات ہے۔ اس وقت کے ڈپٹی ڈائریکٹر ذوالفقار زلفی نے جھوٹے سچے الزامات لگا کر شاعروں ادیبوں کے خلاف ایک ناخوشگوار فضا ہموار کر دی جس کے نتیجے میں الحمراء ادبی بیٹھک کو تالا لگا دیا گیا اور شاعر ادیب اپنے مستقل ٹھکانے سے محروم ہو کر ادھر اُدھر بیٹھنے لگے۔ ادبی بیٹھک میں تقریبات کے انعقاد کے لیے پانچ ہزار روپے کرایہ مقرر کر دیا جبکہ اس سے پہلے ادبی تقریبات کے لیے کوئی کرایہ نہیں تھا۔

بیٹھک کے ممبران نے دبا دبا احتجاج کیا جس کا ظاہر ہے کوئی نتیجہ نہیں نکلنا تھا مگر بعض دوست خاموشی سے نہیں بیٹھے اور انھوں نے عملی طور پر اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے علاوہ کامران نذیر اور ڈاکٹر ایم ابرار نے کیپٹن صاحب سے ملاقات کی اور ان کا موقف جانا انھوں نے کہا بعض افراد بیٹھک میں سگریٹ پیتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس وقت بیٹھک سے سگریٹ کارنر ختم کر دیا گیا تھا اور سگریٹ نوشی پر پابندی تھی۔ (حالانکہ نوشی وہاں کبھی نہیں آئی) لہٰذا انھوں نے بیٹھک کھولنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ہم نے پریس کلب کی لٹریری کمیٹی کے سیکرٹری اور صحافی اقبال بخاری کی مدد لی اور اخبارات میں بیٹھک کی بندش کے خلاف خبریں چلوا دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی روز میں بیٹھک کھول دی گئی۔ مگر یہ بھی کہا کہ بیٹھک میں سگریٹ نہیں پئیں چنانچہ سگریٹ نوش حضرات باہر جا کر سگریٹ پی لیتے اور دوبارہ اندر آکر چائے کی پیالی میں طوفان برپا کر دیتے۔ ۲۰۱۸ء کے آس پاس بیٹھک میں آنے والوں کی تعداد بہت کم ہونے لگی۔ خالد احمد کی وفات کے بعد بہت سے لوگ ویسے ہی بیٹھک آنا کم ہو گئے تھے۔ کچھ وفات پا گئے تھے مگر ۲۰۱۸ء کے بعد روزانہ آنے والوں میں میرے علاوہ نجیب احمد، کنول فیروز کامران نذیر، منیر راج، مسعود اختر، اعجاز فیروز اعجاز، نون عین صابر اور چند اور دوست ہی رہ گئے تھے البتہ تقریبات میں بہت سارے شاعر ادیب شریک ہوتے تھے۔ ۲۰۱۹-۲۰ء میں کرونا کی وبا پھیلی تو سب کچھ ہی بند ہو گیا۔ سبھی لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے۔ قریباً سال بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب زندگی دوبارہ رواں دواں ہوئی تو حسب معمول

کچھ شاعروں ادیبوں نے ادبی بیٹھک کا رُخ کیا مگر وہاں کے عملہ نے بتایا کہ ابھی کرونا کے اثرات باقی ہیں اور کچھ مرمت وغیرہ بھی کی جا رہی ہے لہٰذا بیٹھک بند رہے گی۔ اس دوران کیپٹن عطا محمد خان ریٹائرڈ ہو کر جا چکے تھے۔ ان کے بعد کچھ اور ای ڈی بھی آئے اور چلے گئے۔ شومئی قسمت سے ذوالفقار علی زلفی ایگزیکٹو ڈائریکٹر بن گئے۔ وہ شاعروں ادیبوں کے پہلے ہی خلاف تھے۔ اس وقت کی چیئرپرسن ایگزیکٹو باڈی منزہ ہاشمی کے حکم پر زلفی نے ادبی بیٹھک کا نقشہ بدل دیا۔ وہاں سے کینٹین ختم کر دی گئی۔ مرحوم شاعروں کی لگی ہوئی تصویریں اُتار دی گئیں۔ نوٹس بورڈ اُتار دیا گیا البتہ پرانے اے سی کی جگہ نئے اے سی لگا دیئے گئے۔ دراصل منزہ ہاشمی ادبی بیٹھک کو اپنا دفتر بنانا چاہتی تھیں۔ بیٹھک کے دروازے کے ساتھ لگا ہوا الحمرا ادبی بیٹھک کا بورڈ بھی اُتار دیا گیا اور یہ خبر ملی کی ادبی بیٹھک ختم کر دی گئی ہے۔ اس پر میں نے فیس بک پر خبر چلا دی کہ الحمراء انتظامیہ نے بیٹھک بند کر دی ہے۔ خبر چلتے ہی ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ ہر کوئی اس کی مخالفت میں بول پڑا اور الحمرا انتظامیہ کو برا بھلا کہنے لگا۔ شام کو مجھے زلفی صاحب کا فون آ گیا اور انھوں نے کچھ سخت لہجے میں کہا یہ پوسٹ ہٹا دیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آپ ہم سے مذاکرات کریں۔ انھوں نے کہا کل صبح چند لوگ آ جائیں۔ اب شاعروں ادیبوں کا زلفی صاحب سے ملنے کا طے ہوا۔ ہم ایک وفد کی صورت میں ان سے ملے۔ اس وفد میں ڈاکٹر ایوب ندیم، کامران نذیر، شہزاد تابش، ڈاکٹر ایم ابرار، پروفیسر مشکور صدیقی، ڈاکٹر عنصر پرویز اور کچھ اور دوستوں کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔ انھوں نے ہمیں کانفرنس روم میں بٹھایا۔ چائے بھی پلائی اور کچھ اپنی کہی کچھ ہماری سنی۔ آخر کار طے ہوا کہ بیٹھک صرف ادبی تقریبات کے لیے کھولی جائے گی۔ بیٹھنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ تقریب کے اختتام کے فوراً بعد بیٹھک بند کر دی جایا کرے گی۔ ایسا ہی ہونے لگا۔ ادبی بیٹھک کے نام کا نیا بورڈ لگا دیا گیا اور تزئین و آرائش بھی کر دی گئی۔ تقریبات کا سلسلہ جاری رہا۔ چند ماہ گزارنے کے بعد زلفی صاحب اپنی پہلی کرسی پر چلے گئے اور ای ڈی کی کرسی سلیم ساگر نے سنبھال لی جو کہ شاعر بھی ہیں مگر انھوں نے شاعروں کے لیے کچھ نہ کیا۔ وہ زلفی صاحب کے اشاروں پر چلتے رہے اور ان کی باتوں میں آ کر ایک بار پھر ادبی بیٹھک بند کر دی۔ وجہ صرف سگریٹ نوشی قرار دی گئی۔ ہمارے چند دوست سگریٹ پینے کے عادی تھے۔ وہ گفتگو کے دوران بھی سگریٹ پیتے تھے اور بیٹھک میں ان سے یہ غلطی سرزد ہو گئی جسے کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کر لیا۔

اس صورت حال سے روزانہ آنے والے دوست مایوس ہو گئے اور انھوں نے الحمراء آنا چھوڑ دیا۔ چند دوست آتے اور کینٹین پر بیٹھ جاتے۔ بیٹھک کے دروازے کو حسرت سے دیکھتے۔ ان آنکھوں نے کنول فیروز، منیر راج اور مسعود اختر کو بیٹھک کی سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا اور خود بھی ان کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھ کر کچھ وقت گزارا۔ بیٹھک کی بندش کا سب سے زیادہ دکھ مجھے ہوا کہ میں قریباً روزانہ وہاں کچھ دیر کے لیے آتا تھا۔ اس بار میں نے حسین

مجروح کو تیار کیا۔ انھوں نے سلیم ساگر سے مل کر بیٹھک کھلوانے کا فرمان جاری کروایا اور اگلے دن بہت سارے شاعروں ادیبوں کو فون کر کے بیٹھک بلوایا۔ دراصل ۲۰۲۱ء کے بعد شاعر ادیب الحمراء آنا چھوڑ گئے تھے۔ بہت سارے وفات پا گئے۔ کچھ نے دوسرے ٹھکانے ڈھونڈ لیے۔ دو چار افراد آتے تھے جس پر انتظامیہ کا یہ کہنا بجا تھا کہ تین چار افراد کے لیے بیٹھک کیوں کھولی جائے۔ اے سی بھی چلتا ہے اور بلب بھی جلتے ہیں لاکھوں کا بل آتا ہے۔ بہر حال حسین مجروح کی کال پر اگلے دن میں بھی بیٹھک پہنچ گیا۔ دیگر آنے والوں میں مشکور صدیقی، پروفیسر رمضان شاکر، آفتاب جاوید، آغر ندیم سحر، کنور عبدالماجد، کنول فیروز وغیرہ بیٹھک میں آکر بیٹھے اور باہر کی کینٹین سے چائے منگوا کر پی گئی۔ شاعروں ادیبوں کے لیے یہ بھی ایک مشکل تھی کہ بیٹھک میں چائے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ گارڈ کو یا کسی اور کو کہہ کر چائے باہر سے منگوانی پڑتی جو کچھ اچھا تجربہ نہیں تھا۔

چند روز حسین مجروح آئے پھر وہ بھی آنا بند ہو گئے جب کہ انتظامیہ نے وعدہ لیا تھا کہ بیٹھک کو بیٹھک لگنا چاہیے۔ اس دوران ناچیز قریباً روزانہ بیٹھک جاتا رہا کہ بیٹھک کی رونقیں بحال ہو جائیں۔ شاعر ادیب نون عین صابر بھی اپنے دوستوں کو بلا لیتے اور بیٹھک میں کچھ وقت کے لیے رونق لگ جاتی لیکن نئے لوگوں کا بیٹھک میں آنے کا رجحان نہ بن سکا۔ تین چار افراد کے لیے بیٹھک کھولنا غیر مناسب عمل تھا۔ چنانچہ بیٹھک کا بند ہو جانا ہی بہتر تھا۔ اس لیے اب الحمرا ادبی بیٹھک صرف تقریبات کے لیے کھولی جاتی ہے۔ تقریبات بھی بہت کم ہو گئی ہیں۔ ہفتے میں ایک یا دو تقریبات ہوتی ہیں۔ باقی لاہور کی مختلف جگہوں پر منعقد کی جاتی ہیں۔ سب نے اپنے اپنے ٹھکانے بنا لیے ہیں۔

یونیسکو نے اگر لاہور کو شہر ادب قرار دیا تھا تو اس میں الحمراء کے مختلف ہالوں اور ادبی بیٹھک میں ہونے والی تقریبات کا بہت عمل دخل تھا۔ الحمرا ایک ادبی حب ہے۔ یہاں سے ہر شاعر، ادیب، فنکار کو شناخت ملتی ہے۔

۲۰۱۹ء سے ۲۰۲۳ء تک چار سال تک لاہور کے پاس ''شہر ادب'' کا اعزاز موجود رہا۔ شاید مستقبل میں اسے دوبارہ اس اعزاز سے نوازا جائے۔ معلوم نہیں کہ یونیسکو کا یہ اصول ہے کہ نہیں کہ دوبارہ سے کسی کو کوئی اعزاز دے۔ بہر کیف ادبی بیٹھک کا ادب کی ترویج و ترقی میں ایک اہم کردار تھا اور رہے گا۔ اہلِ ادب کا بھی یہ فرض ہے کہ ادب کے فروغ کے لیے ادبی بیٹھک میں زیادہ سے زیادہ تقریبات کرائیں کیوں کہ اس وقت لاہور میں ادبی بیٹھک سے زیادہ خوب صورت کوئی جگہ، کوئی ادارہ، کوئی مرکز نہیں۔ یہ ہماری روایات کا ایک درخشندہ باب ہے جسے کھلا رہنا چاہیے تا کہ معطر اور معتبر جھونکے ہمارے چہرے پر گرما کی سرد ہوا کی طرح پڑتے رہیں۔ اسی میں شاعروں ادیبوں کی بقا اور ادب کی ترقی کا راز پنہاں ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک عہد کا اختتام ہوا

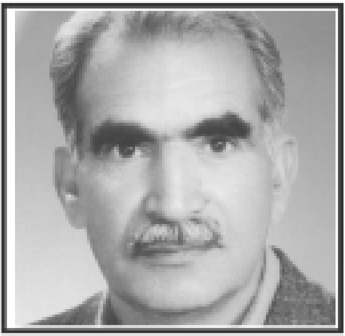

پروفیسر محمد ارشاد بھی رخصت ہو گئے۔ محمد ارشاد کے نام سے وہ لکھتے تھے۔ محمد ارشاد ایک عہد کا نام تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عہد ختم ہو گیا۔

ہری پور سے اگر ہم چھپر روڈ پر جائیں تو دریائے دوڑ پار کرنے کے فوراً بعد مغرب کی طرف کنارے کنارے تھوڑا آگے کی طرف چل پڑیں تو کھناں گاؤں ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

کسی زمانے میں اس علاقے میں دریائے دوڑ پر کوئی پل نہیں بنا تھا۔ جب دوڑ میں پانی زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ گاڑیاں آسانی سے اس میں سے گزر جاتیں۔ اکا دکا لوگ پیدل بھی آر پار آتے جاتے تھے۔ لیکن جن دنوں برسات ہوتی دریائے دوڑ اس قدر بپھرا ہوا ہوتا تھا کہ پیدل لوگ تو دور کی بات گاڑیاں بھی اس میں سے نہیں گزر جاتی تھیں۔

ایسے میں ٹریکٹر والوں کی موجیں لگ جاتیں۔ وہ اپنی مرضی کا کرایہ لے کر لوگوں کو آر پار کرواتے۔ بعض دفعہ دریائے دوڑ دس دس دن چڑھا رہتا۔ دونوں طرف کی بسیں اپنی اپنی طرف پر چلتیں اور دوڑ کے کنارے سواریوں کو اتار دیتیں۔

معروف دانش ور، محقق، نقاد اور رباعی کو شاعر پروفیسر محمد ارشاد کا تعلق کھناں گاؤں سے تھا۔ اور وہ اسی دوڑ میں سے گزر کر گورنمنٹ ڈگری کالج ہری پور میں فلسفے کی کلاسیں لینے کے لیے پہنچتے تھے۔ ستر کی دہائی میں انھوں نے علی عباس جلال پوری کی کتاب ”عام فکری مغالطے“ پر ایک طویل مضمون لکھا جو تین قسطوں میں احمد

سعید اشعر

ندیم قاسمی کے مجلّہ ''فنون'' میں چھپا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ترقی پسند حلقوں میں علی عباس جلال پوری کا ایک ایک لفظ سند کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سنجیدہ ادبی حلقوں میں تموج پیدا ہو گیا۔ فنون کے خطوط کے لیے مخصوص حصہ میں مختلف نکات پر بحث شروع ہو گئی۔ شروع شروع میں علی عباس جلال پوری نے پوری قوت سے اپنے موقف کا دفاع کیا لیکن آخر میں انھوں نے پروفیسر صاحب کا نکتہِ نظر تسلیم کر لیا۔ موضوع کتنا ہی گھمبیر کیوں نہ ہو پروفیسر صاحب کا اسلوب تحریر بہت ہی سلیس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خواص کے ساتھ ساتھ عام قاری کے لیے بھی ان کی تحریر میں بڑی کشش تھی۔ اگلے مرحلے میں پروفیسر صاحب نے محمد حسن عسکری کی ایک مختصری کتاب ''جدیدیت اور مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ'' پر کچھ سوالات اٹھا دیے۔ محمد حسن عسکری اُردو زبان وادب کے نامور نقاد، مترجم، افسانہ نگار اور انگریزی ادب کے استاد تھے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور افسانوں میں جدید مغربی رجحانات کو اردو دان طبقے میں متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ نامور شاعر سلیم احمد سمیت ادباء کا ایک بہت بڑا حلقہ ان کا معتقد تھا۔ ایک بھونچال آ گیا۔ عسکری پسند حلقوں نے پروفیسر صاحب کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس مقصد کے لیے ''روایت'' کے نام سے باقاعدہ ایک میگزین جاری کیا گیا جو اچھا خاصا ضخیم تھا۔ مجھے یقین ہے فنون کی سرکولیشن بھی اس وقت ایک دم چار گنا ہو گئی ہو گی۔ پروفیسر صاحب کی شہرت پوری دنیا کے سنجیدہ اردو ادبی اور فکری حلقوں تک پہنچ چکی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ پاکستان میں ترقی پسند فکر کے حامل افراد نے دل سے ان کو اپنا سرخیل تسلیم کر لیا تھا تو غلط نہ ہو گا۔ پروفیسر صاحب نے اس وقت جلتی پر پٹرول چھڑک دیا جب انھوں نے انشائیہ نویسی کو اپنا موضوع سخن بنایا وہ براہ راست دبستانِ سرگودھا پر حملہ آور ہوئے اور ان کی انشائیہ نگاری کو بہ یک جنبش قلم مسترد کر دیا۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک مشکور حسین یاد برانڈ انشائیہ قابل قبول تھا۔ دبستان سرگودھا کا مشتعل ہونا فطری تھا۔ جس حد تک ممکن تھا انھوں نے پروفیسر صاحب کی مخالفت میں اپنا زور لگایا۔ ڈاکٹر انور سدید نے انشائیہ نویسی کے فن پر باقاعدہ کتاب لکھ ڈالی۔ اس دشمنی میں کچھ لوگ اس قدر آگے نکل گئے کہ انھوں نے پروفیسر صاحب کے وجود سے ہی انکار

کر دیا۔ انھوں نے یہ بے پر کی اڑا دی کہ اس پروے کے پیچھے کوئی اور ہستی ہے۔

پروفیسر صاحب نے اور بھی بہت سارے موضوعات پر قلم اٹھایا تھا۔ صنفِ رباعی پر تو ان کی باقاعدہ کتاب آچکی ہے۔ پروفیسر صاحب اگرچہ فلسفہ کے استاد تھے لیکن ان کی مشرقی و مغربی تمام جدید وقدیم علوم پر گہری نظر رہی ہے۔ باقاعدگی سے اخبارات کا بھی مطالعہ کرتے۔ حالات حاضرہ میں ان کی خاص دلچسپی رہی۔ انھیں اردو، فارسی، عربی، انگلش سمیت کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ سب سے پہلے میں نے بزم لوح وقلم کے ایک اجلاس میں ان کا ایک مقالہ سنا تھا۔ اس وقت جاوید قریشی جنرل سیکرٹری تھے - بعد میں میری درخواست پر پروفیسر صاحب نے کاروانِ ادب کے ایک دو اجلاسوں کی صدارت بھی کی تھی۔

ایک دفعہ فرمایا۔

''آپ علامہ اقبال کو پڑھا کریں۔''

''مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی۔

''کیسا ڈر'' انھیں میرا جواب عجیب لگا۔

علامہ اقبال میرے اوپر قابض ہو جائے گا۔ اس طرح میں ختم ہو جاؤں گا۔''

''یہ بات تو درست ہے۔ علامہ اقبال بہت طاقتور ہے۔''

ایک دن صبح صبح محبوب عطا میرے پاس تشریف لائے۔ خوشخبری دی کہ ان کا نیا شعری مجموعہ تیار ہے۔ جس میں ایک حصہ رباعیات کے لیے مختص ہے۔ میں نے دلی مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے سگریٹ پیش کرتے ہوئے سموسوں کی دعوت دی۔ مجھے کھٹکا ہوا ضروری کوئی بات ہے۔ میں نے سمجھایا۔ ''سموسے شام کو کھائیں گے۔ اس وقت چائے پیتے ہیں۔''

دو تین منٹ کے بعد بے صبری سے بولے۔

''پروفیسر محمد ارشاد صاحب سے تمھارا تعارف ہے۔ ان سے میری رباعیات پر کچھ لکھوا دو۔''

شام کے وقت ہم پروفیسر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے میری بات کی لاج رکھی اور ایک صفحہ لکھ کر دے دیا۔

پروفیسر صاحب کچھ عرصہ سے علیل تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ادبی سرگرمیاں بالکل ترک نہیں کر دی تھیں ''بیاض'' کے پچھلے ایک شمارے میں ان کی رباعیات تھیں۔ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ اس شمارے میں میری کچھ رباعیات بھی موجود تھیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی ہستی کے ساتھ کہیں میرا نام بھی آئے گا۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔

☆☆☆☆☆

''ایک انشائیاتی خوشبو کی کہانی''

باغ کشمیر پہاڑوں کے دامن میں بسا وہ خوب صورت شہر جہاں فضا میں موسموں کا جادو رچا ہوا ہے۔ ہوا میں پائن کے درختوں کی مہک، چشموں کی کھنک اور دھوپ کے نرم جھونکے ایسے محسوس ہوتے ہیں جیسے قدرت نے خود یہاں سکون کی ایک کتاب کھول رکھی ہو۔ انہی خوشگوار مناظر میں ایک دن مقامی سکول کے آنگن میں بچوں کے یوم آزادی کی تقریب منعقد تھی۔ رنگ برنگے جھنڈے، ننھے ہاتھوں میں لہراتے پرچم اور چہروں پر چمکتی معصوم مسکراہٹیں۔۔ فضا میں ایک انوکھا جوش اور وطن کی محبت کی خوش بو گھلی ہوئی تھی۔

اسی ماحول میں ایک گوشے میں، مَیں نے ایک شخص کو دیکھا متین، خاموش، مگر چہرے پر علم و وقار کی ایک ہلکی سی چمک۔ ہاتھ میں کتاب تھی، جس کے سرورق پر جلی حروف میں لکھا تھا ''ورق ریزے'' میں نے اس وقت تک دلشاد اریب کا نام نہیں سنا تھا، مگر ان کے ہاتھ میں وہ کتاب دیکھ کر دل میں ایک انجانی تجسس کی لہر دوڑ گئی۔ تقریب کے بعد تعارف کی رسمی سی گفت گو ہوئی چند جملے، ایک خندہ پیشانی اور پھر نمبروں کا تبادلہ۔ یوں ایک ادبی تعلق کی ابتدائی لکیر کھنچ گئی۔

بعد کے دنوں میں ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا۔ کبھی کسی نشست میں، کبھی چائے کے پیالے کے ساتھ اور کبھی محض کتابوں اور قلم کی گفت گو میں۔ ان میں ایک انوکھی سنجیدگی ہے، مگر اس سنجیدگی کے پردے میں ایک شوخ مسکراہٹ بھی چھپی ہے جو کسی بھی مکالمے کو خشک نہیں ہونے دیتی۔ جب انھوں نے اپنی کتاب ورق ریزے مجھے دی تو میں نے ازراہ تجسس پوچھا!

''دلشاد اریب صاحب! یہ ورق ریزے کیا ہیں؟''

وہ ذرا ٹھہرے، پھر مسکرا کر بولے!!

''بھئی، زندگی کے چند بکھرے ہوئے لمحے تھے، سوچا انہیں سمیٹ لوں، شاید کوئی پڑھ کر مسکرا دے۔''

اور واقعی، ورق ریزے محض انشائیوں کا

شاہ روم خان ولی

مجموعہ نہیں، بل کہ زندگی کی ان ریزہ ریزہ کہانیوں کا تذکرہ ہے جو بظاہر معمولی دکھائی دیتی ہیں مگر دلشاد اریب کے قلم نے انھیں معنی کی چمک بخشی ہے۔ ان کے انشائیوں میں روزمرہ کے تجربات، ذاتی مشاہدات اور سماجی رویوں کی باریکیاں اس لطیف مزاح کے ساتھ بُنی گئی ہیں کہ قاری کبھی مسکراتا ہے، کبھی چونکتا ہے اور کبھی ایک آہ بے ساختہ کے ساتھ تحریر میں گم ہو جاتا ہے۔

ان کے ہاں طنز کسی تلوار کی طرح نہیں بل کہ ہلکی سی مسکراہٹ کی صورت برتا گیا ہے۔ کہیں وہ خود پر ہنستے ہیں، کہیں دنیا کی بے ترتیبی پر۔ کبھی زندگی کے تضادات ان کے انشائیے میں چائے کی پیالی کی طرح ہلکورے لیتے ہیں اور کبھی وہ سنجیدگی کو ہلکے پھلکے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری نہ ہنسنے سے باز رہتا ہے، نہ سوچنے سے۔

”ورق ریزے“ کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ دلشاد اریب کو مشتاق احمد یوسفی سے خاص اُنس ہے۔ ان کے اسلوب میں یوسفی کی فکری لطافت اور مشاہدے کی کاٹ جھلکتی ہے، مگر وہ تقلید نہیں کرتے، اپنی راہ خود بناتے ہیں۔ وہ مزاح کو سنجیدگی کی ضد نہیں بناتے، بل کہ اس کا جواز ٹھہراتے ہیں۔ ان کے انشائیے قاری کو ہنسی کے ساتھ ساتھ زندگی کی گہرائیوں میں جھانکنے کی دعوت دیتے ہیں۔

میرے نزدیک دلشاد اریب کی سب سے بڑی خوبی ان کی فطری سچائی ہے۔ وہ لکھتے وقت کسی لفاظی کے حصار میں نہیں رہتے جو محسوس کرتے ہیں، وہی صفحے پر اتر آتا ہے۔ یہی سادگی، یہی شفافیت ان کے انشائیوں کو قابلِ قدر بناتی ہے۔

آج جب میں ان کی کتاب ورق ریزے کو اپنے میز پر رکھ کر چائے کی چسکی لیتا ہوں تو باغ کی وہ تقریب، بچوں کی آوازیں، اور وہ پہلی ملاقات سب یاد آ جاتی ہیں۔ لگتا ہے جیسے دلشاد اریب صاحب اب بھی اسی میز پر بیٹھے ہیں آنکھوں میں مسکراہٹ اور لہجے میں وہی خفیف مزاح لیے کہہ رہے ہوں:

”زندگی کے ان ورقوں کو اگر سمیٹنا مشکل ہو تو کم از کم ان پر ہنس لینا تو ہمارا حق ہے نا!“

اور میں بے اختیار مسکرا دیتا ہوں کیوں کہ یہی تو دلشاد اریب کا کمال ہے کہ وہ زندگی کے ہر سنجیدہ لمحے میں ایک لطیف انشائیہ چھپا دیتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دلشاد اریب صاحب کے قلم کو مزید روانی، گہرائی اور زندگی بخشے۔ ان کی تحریریں اسی طرح دلوں کو مسکراتی رہیں، فکر کے چراغ روشن کرتی رہیں اور اردو ادب کے افق پر ان کا نام دیر تک جگمگاتا رہے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

اسد اعوان کی غزل میں تقدیسِ حسن اور وارداتِ عشق کا جمالیاتی اظہار......

یہ اصولِ حرمتِ دیدار ہے بیٹھے رہو
محفلِ تقدیسِ حُسنِ یار ہے بیٹھے رہو

خوف کیسا ہے درِ پیرِ مغاں پر میکشو
عافیت میں اب تو ہر میخوار ہے بیٹھے رہو

کچھ تو پوشیدہ ہے چشمِ کائناتِ شوق میں
کب کھلے گا پردۂ اسرار ہے بیٹھے رہو

شغلِ اربابِ عقیدت ہے یہ رقصِ خوں چکاں
صاحبِ مرقد سے یہ اظہار ہے بیٹھے رہو

ہم کو بھی ہے شاعرِ آشفتہ سر سے آگہی
دین داروں میں وہ دنیا دار ہے بیٹھے رہو

آستانۂ جمالِ یار پر محفل کے بعد
سفرۂ عشاق بھی تیار ہے بیٹھے رہو

عہدِ رفتہ میں بہت رغبت رہی ہم کو اسد
اب اُسے ملنا مگر بیکار ہے بیٹھے رہو
....

اسد اعوان اردو غزل کے اُن شعرا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے کلاسیکی روایت کو جدید فکری و جمالیاتی جہتوں کے ساتھ جوڑ کر ایک نیا شعری منظرنامہ تخلیق کیا ہے۔ ان کی شاعری برصغیر کی غزلیہ روایت میں اپنے مضامین کی ندرت، زبان کے تنوع اور فکری گہرائی کے باعث نمایاں نظر آتی ہے۔

ان کی غزلوں میں رومان، مزاحمت، نفسیات اور فلسفہ کی تہہ در تہہ پرتیں موجود ہیں۔ شعری زبان میں عربی، فارسی، ہندی

مسعود تنہا

اور سنسکرت کے الفاظ کی آمیزش ان کے لسانی شعور اور تہذیبی وسعت کی مظہر ہے۔ وہ قادر الکلام شاعر ہیں جن کی غزل میں موسیقیت، روانی اور کلاسیکی نغمگی اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہی زبان و بیان کی نزاکت ان کے اشعار کو محض خیال نہیں، بل کہ ایک فکری اور روحانی تجربہ بنا دیتی ہے۔

زیرِ نظر غزل میں شاعر نے عشق کو محض جذبے کی شدت کے طور پر پیش نہیں کیا، بل کہ اسے ایک مقدس اور روحانی واردات کے طور پر برتا ہے۔ غزل کا مطلع ہی قاری کو ایک ایسی فضا میں لے جاتا ہے جہاں دیدارِ محبوب عبادت اور ریاضت بن جاتا ہے۔ یہاں شاعر عشق کے اس مرحلے کی تصویر کھینچتا ہے جہاں انتظار خود عقیدت کا حصہ بن جاتا ہے۔

یہ ابتدائی کیفیات بتاتی ہیں کہ اسد اعوان کے نزدیک عشق کوئی سرسری جذبہ نہیں، بل کہ ایک شعوری ریاضت ہے۔ ایک ایسا تجربہ جو حسن کی تقدیس سے جنم لیتا ہے۔ غزل کا ایک نمایاں پہلو تصوف اور سرمستی کا حسین امتزاج ہے۔ ''پیرِ مغاں'' اور ''میکدہ'' جیسے استعارے دراصل عشقِ حقیقی کے اس راستے کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں خوف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شاعر کے ہاں میکدہ، مے اور مغاں صوفیانہ انبساط اور عشق کی بے خوف سپردگی کے استعارے ہیں۔ یہ اس کیفیت کی علامت ہیں جہاں عاشق اپنی انانیت سے گزر کر عافیت کے مقامِ فنا تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسد اعوان کا تخیل ایک نئی معنویت تخلیق کرتا ہے۔ ان کے یہاں عشق محض جمالیاتی کشش نہیں بل کہ روحانی نجات کا استعارہ بن جاتا ہے۔ شاعر کائنات کے اسرار اور عشق کے راز کے پردوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ عاشق علم و شوق کے اس مقام پر کھڑا ہے جہاں اسے معلوم ہے کہ رازِ ظہور کے اپنے وقت کے پابند ہیں۔ یہاں انتظار، بے بسی نہیں بل کہ شعوری صبر اور عرفانی بصیرت کا مظہر ہے۔

غزل کا ایک اور پہلو عشق کو شہادت اور عقیدت کے درجے پر فائز کرتا ہے۔ عشق محض سرشاری یا وجد نہیں بل کہ قربانی، درد

اور خوں نچوڑنے والی کیفیات کا نام ہے۔ یہ وارفتگی صاحبِ مرقد کے حضور ایک عقیدت مندانہ اظہار بھی ہو سکتی ہے اور وفاداری کی انتہا بھی۔ اس طرح شاعر عشق کو محض انسانی تعلق نہیں بل کہ ایک روحانی معراج کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس غزل میں اسد اعوان کے عمومی اسلوب سے قدرے انحراف نظر آتا ہے۔ جہاں ان کے دوسرے کلام میں عشقیہ تجربات کی رومانوی وسعت اور شخصی تاثرات غالب ہوتے ہیں، وہیں اس غزل میں ایک مقدس اور روحانی عشق کا رنگ نمایاں ہے۔

یہ غزل ان کے شعری سرمائے میں ایک منفرد رخ کے طور پر سامنے آتی ہے، جہاں عشق کی حرارت کے ساتھ فکر کی پاکیزگی اور احساس کی تقدیس معنی و مفاہیم کا ایک نیا جہان آباد کرتی ہے۔ اسد اعوان نے اس غزل میں اپنی نفسیاتی بصیرت کا بھی بھرپور اظہار کیا ہے۔ وہ خود کو ایک ایسے شاعر کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اپنے وجود، اعتقاد اور معاشرتی تضادات سے پوری طرح آگاہ ہے۔ دین داری اور دنیاداری کے مابین موجود دوغلے رویوں پر ان کا طنزیہ مشاہدہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عشق کو محض شخصی واردات نہیں سمجھتے بل کہ اسے سماجی تنقید کا وسیلہ بھی بناتے ہیں۔

اسد اعوان کی غزل میں فکری اور روحانی بالیدگی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ عشق کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، وصال کے بعد بھی ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے۔ یہی مسلسل سفر عشق کی معراج ہے۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ماضی کی یادیں اور پرانی وابستگیاں بامعنی سے بے معنی ہو جاتی ہیں، اور عاشق ایک نئے شعوری درجۂ فہم تک پہنچتا ہے۔ یہی احساس اس غزل کو فکری پختگی عطا کرتا ہے اور شاعر کی تجربہ کاری کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ غزل اسد اعوان کی شعری عظمت کی مکمل نمائندہ تخلیق ہے۔ ان کے ہاں عشق عریاں جذبات کا شور نہیں، بل کہ ایک باوقار روحانی تجربہ ہے جو انسان کو خود آگہی، صبر، استقامت اور جمالیاتی شعور کی راہوں پر گامزن کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

محبت اور جمالیات کا حصار

احمد سبحانی آکاش کا شعری مجموعہ حصار چشم اردو شاعری کے اس سفر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جہاں روایت اور جدت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئی تخلیقی دنیا کو جنم دیتی ہیں۔ اس مجموعے کو پڑھتے ہوئے قاری محض چند غزلوں کا ہی مطالعہ نہیں کرتا بلکہ ایک ایسے فکری اور جمالیاتی سفر سے گزرتا ہے جس میں محبت، امید، خوشبو اور پھول مسلسل اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ شاعری کی یہ خوبی ہے کہ وہ قاری کو اپنے لفظوں کے حصار میں قید کر لیتا ہے، لیکن یہ قید ایسی ہے جس میں گھٹن کے بجائے کشادگی ہے، جہاں آنکھوں کا حصار روشنی، رنگ اور خوشبو سے لبریز ہے۔ یہی وہ بنیادی تاثر ہے جو اس کتاب کو دوسرے شعری مجموعوں سے ممتاز کرتا ہے۔

حصار چشم میں بار بار آنے والے الفاظ جیسے خوشبو، پھول اور محبت دراصل ان کی داخلی دنیا کے بنیادی استعارے ہیں۔ لیکن یہ استعارے محض ظاہری حسن کے نمائندہ نہیں بلکہ ان میں ایک معنوی گہرائی ہے جو انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔

ایک ماحول بدلتا ہے جو پل پل آکاش
ایک خوشبو ہے جو ہر بار جدا لگتی ہے

....

کون سے خواب کی خوشبو کے طلسمات میں ہیں
بھید کھولے گی نگاہوں پہ ہماری تصویر

....

حصار چشم سے پھوٹے گی ایک کونپل اور
کئی چراغ، کئی خوشبوئیں اچھالے گی

....

لبنیٰ صفدر

شاعری ہمیشہ انسان کے داخلی اور خارجی تجربات کا حسین امتزاج رہی ہے۔ شاعر اپنے گردوپیش کی دنیا کو دیکھتا ہے، اسے اپنے دل کی آنکھ سے محسوس کرتا ہے، اور پھر اسے الفاظ میں ڈھال کر قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ احمد سبحانی آکاش کے ہاں یہ عمل نہایت لطیف اور فنکارانہ انداز میں سامنے آتا ہے۔ ان کے اشعار میں قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ محض لفظ نہیں بلکہ زندہ کیفیات ہیں جو دل سے نکل کر دل تک پہنچتی ہیں۔

اردو شاعری کی روایت میں محبت ہمیشہ ایک مرکزی مضمون رہا ہے۔ میر کی غزلوں میں یہ مضمون کرب اور جدائی کے ساتھ جڑا ہوا ہے، غالب کے ہاں یہ فلسفیانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے، اقبال کے ہاں یہ ایک کائناتی جذبہ بن کر سامنے آتا ہے، اور جدید شعرا کے ہاں یہ داخلی تنہائی اور وجودی بے معنویت کے ساتھ جڑا نظر آتا ہے۔ احمد سبحانی آکاش نے ان تمام روایات سے اکتساب کرتے ہوئے اپنی محبت کو نہ صرف ایک ذاتی تجربہ بنایا ہے بلکہ اسے آفاقی سطح پر بھی برتا ہے۔ ان کے ہاں محبت محض ایک شخص تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو کائنات کو جوڑتی ہے، جو انسان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتی ہے، اور جو زندگی کو جینے کے قابل بناتی ہے۔ ان کی محبت میں نہ تو محض جذباتی شدت ہے اور نہ ہی سطحی رومانوی رنگ، بلکہ اس میں ایک فکری گہرائی اور جمالیاتی نزاکت ہے۔

وہ میرا آئینہ ہے اور میں طلب اس کی
جہاں، جہاں اسے چاہوں وہیں دکھائی دے

....

ہم تخیل کی بے کرانی کو
دائرے میں ہنر کے آئے

....

حصار چشم کو اگر ایک تخلیقی کائنات کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ قاری کو ایک ایسی فضا میں لے جاتا ہے جہاں ہر لفظ خوشبو بن کر فضا میں گھلتا ہے اور ہر خیال پھول کی صورت کھلتا ہے۔ شاعر نے محبت اور امید کے استعاروں کو اس لطافت کے ساتھ برتا ہے کہ وہ محض علامتیں نہیں رہتیں بلکہ قاری کی ذاتی کیفیات کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس میں ایک ایسی آہنگ اور روانی ہے جو نہ صرف دل کو چھوتی ہے بلکہ ذہن کو بھی جگاتی ہے۔ احمد سبحانی آکاش کی یہ کاوش اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعری آج بھی انسان کے لیے روح کی تسکین اور دل کی روشنی کا ذریعہ ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ حصار چشم محض ایک ادبی

تجربہ نہیں بلکہ زندگی کی معنویت کو ازسرِ نو دریافت کرنے کی جستجو ہے۔ شاعر نے اپنے اشعار میں دکھ اور کرب کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن انہیں ہمیشہ محبت اور امید کے رنگ میں ڈھال دیا ہے۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جو اس کتاب کو معاصر اردو شاعری میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔ یہ مجموعہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ انسان مشکل ترین حالات میں بھی کیسے اپنے دل کے چراغ کو روشن رکھ سکتا ہے۔ یہی پیغام اس کتاب کی روح ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ شعری مجموعہ وقت گزرنے کے ساتھ مزید اہمیت اور قدر و قیمت حاصل کرے گا۔

حصارِ چشم کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ شاعر نے زندگی کی تلخیوں اور کربناک لمحوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ ان کے ہاں دکھ اور غم کا ذکر موجود ہے، لیکن یہ دکھ اور غم بھی مایوسی کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ ہر تاریک لمحہ ایک نئی روشنی کی نوید بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی پہلو ان کے کلام کو پرامید اور زندگی سے لبریز بنا دیتا ہے۔ امید ان کے ہاں محض ایک لفظ نہیں بلکہ ایک مستقل کیفیت ہے۔ وہ یہ باور کراتے ہیں کہ زندگی جتنی بھی کٹھن کیوں نہ ہو، اس میں ایک چراغ ہمیشہ جلتا رہتا ہے، اور وہ چراغ محبت اور امید کا چراغ ہے۔ یہی تصور ان کی شاعری کو آج کے دور میں بھی نہایت اہم بناتا ہے، کیونکہ ہمارا زمانہ مایوسی اور ناامیدی سے بھرا ہوا ہے۔ ایسے میں احمد سبحانی آکاش کی شاعری قاری کو سہارا دیتی ہے، اسے اعتماد بخشتی ہے اور اسے یہ احساس دلاتی ہے کہ اندھیروں کے باوجود روشنی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

وہ دل بناؤں گا جس کو کبھی بھی رنج نہ ہو
مزا خوشی سا ہو وہ غم تراشوں گا

کسی کے سامنے شرمندگی سے کیا حاصل
میں جھوٹ بول کے تیرا بھرم تراشوں گا

اس خوبصورت مجموعہ میں سب سے زیادہ متاثر کن پہلو شاعر کی زبان اور اسلوب ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نہ تو محض کلاسیکی پیچیدگیوں کو اپنایا ہے اور نہ ہی حد سے زیادہ سادگی کو۔ ان کا اسلوب ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو روایت اور جدت کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ان کی زبان نہایت رواں، شستہ اور دلکش ہے۔ الفاظ میں ایک خاص موسیقیت ہے جو اشعار پڑھنے کے عمل کو مزید دلکش اور پرلطف بنا دیتی ہے۔ قاری جب ان کے اشعار پڑھتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اشعار دل کی زبان میں لکھے گئے ہوں۔ یہی سادگی اور لطافت اس کلام کو حسین تر بنا دیتی ہے۔ اس کی کچھ امثال ملاحظہ کیجئے۔

عشق ، مہر و وفا ، رواداری
تم فسانے کدھر کے لے آئے

وقت نے لوٹنا نہیں سیکھا
عمر گزرے گی ہاتھ ملتے ہوئے

....

اس طرف خوف کا گزر ہی نہیں
جس طرف دل کا دھیان ہے اس بار

....

ان کی شاعری پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ماضی کی روایت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ حال کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہیں۔ یہی امتزاج ان کی شاعری کو تازگی اور ہمہ گیری بخشتا ہے۔

ان کے کلام میں جمالیات کا پہلو بھی نہایت نمایاں ہے۔ ہر شعر میں ایک تصویری کیفیت ہے، ہر لفظ اپنی ایک رنگین معنویت رکھتا ہے۔ جب وہ خوشبو اور پھول کا ذکر کرتے ہیں تو قاری کے سامنے واقعی خوشبو مہکنے لگتی ہے اور پھول کھلنے لگتے ہیں۔ جب وہ محبت اور امید کا تذکرہ کرتے ہیں تو دل میں واقعی روشنی کی ایک کرن جاگ اٹھتی ہے۔ یہی ان کی شاعری کا اصل کمال ہے کہ وہ قاری کو محض پڑھنے والا نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے شریکِ سفر بنا لیتی ہے۔

اگر اردو شاعری کے منظر نامے میں اس مجموعے کو دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ حصارِ چشم ایک ایسا اضافہ ہے جو اردو ادب کی جمالیاتی اور فکری روایت کو مزید وسعت دیتا ہے۔ احمد سبحانی آکاش نے اپنے اشعار کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ محبت اور امید کا ذکر محض رومانوی شاعری کی حد تک محدود نہیں بلکہ یہ انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ان کا یہ مجموعہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ شاعری کا اصل کام صرف تفریح فراہم کرنا نہیں بلکہ زندگی کے بنیادی سوالات پر غور کرنا اور انسان کے دل و دماغ کو نئی سمت دینا بھی ہے۔

ان کے ہاں محبت اور حسن کا ذکر بار بار آتا ہے لیکن یہ کبھی مصنوعی یا محض جذباتی نہیں لگتا۔ ان کا حسن داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ یہ حسن صرف چہرے یا سراپے میں نہیں بلکہ انسانی رویوں، جذبوں اور خوابوں میں بھی پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پڑھنے والا ہر شخص اس میں اپنے دل کی آواز سن سکتا ہے۔ ہر قاری کو لگتا ہے کہ یہ اشعار اسی کے لیے لکھے گئے ہیں، کیونکہ محبت، خوشبو اور امید ایسے مضامین ہیں جو سب کے تجربات میں مشترک ہیں۔ شاعر نے ان مضامین کو اپنی داخلی دنیا کے ساتھ جوڑ کر ایک ایسی شاعری تخلیق کی ہے جو سب کے دل میں اتر جاتی ہے۔

خاک ہو جائے تجلی کی جھلک پانے پہ
سونگھ لے آنکھ اگر حسن بتاں کی خوشبو

گھڑیاں باندھ کے آنکھوں میں تمناؤں کی
سرخ ہونے کے لیے آئی گلابی تصویر

....

حصار چشم محض ایک شعری مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری اور جمالیاتی دستاویز ہے۔ اس میں محبت ہے تو فلسفہ بھی ہے، اس میں حسن ہے تو حکمت بھی ہے، اس میں جمالیات ہیں تو معنوی گہرائی بھی ہے - یہی وہ امتزاج ہے جو اس کتاب کو اہم بناتا ہے۔ احمد سبحانی آکاش نے اس مجموعے کے ذریعے یہ دکھایا ہے کہ شاعری آج کے دور میں بھی وہی قوت رکھتی ہے جو ماضی میں رکھتی تھی: دلوں کو مسخر کرنے کی قوت، ذہنوں کو جگانے کی قوت، اور زندگی کو امید اور محبت کے رنگوں سے بھر دینے کی قوت۔

بس اک نگاہ تجسس کی بازیابی تک
جمود ذات کو حیرت سے چیر ڈالے گی

....

یہ کہنا بجا ہوگا کہ حصار چشم اردو ادب میں ایک خوشبو کی طرح پھیلنے والا مجموعہ ہے جو آنے والے وقتوں میں بھی اپنی تازگی اور دلکشی برقرار رکھے گا۔ احمد سبحانی آکاش نے اپنے کلام کے ذریعے نہ صرف اپنی فنی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ محبت، امید اور حسن کا ذکر آج بھی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ان کا یہ شعری مجموعہ قاری کو بار بار اپنی طرف کھینچتا ہے، اسے ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں اندھیرے بھی روشنی بن جاتے ہیں اور دکھ بھی محبت کی طاقت سے مٹ جاتے ہیں۔ یہی اس کتاب کا سب سے بڑا کمال ہے اور یہی وجہ ہے کہ حصار چشم کو اردو شاعری میں ایک منفرد اور اہم مقام حاصل ہوگا۔

چند خوبصورت اشعار ملاحظہ کیجئے گا:

جل اٹھا داغ کسی یاد کا سینے میں اگر
آگ کو پھول کہا اور دھواں کی خوشبو

جس جگہ روح میں تسکین کی لو پھوٹی تھی
سانس لیتا ہوں تو آتی ہے وہاں کی خوشبو

....

یہ بات کیسے چھپاؤ گے آنکھ والوں سے
کہاں چراغ جلا اور کہاں ہوا روشن

یہ ضروری تو نہیں، عشق بھی تسلیم کرے
بات جو فہم و فراست کو بجا لگتی ہے

....

زندگی تو بھی مروت کی رواداری میں
پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے جا لگتی ہے

☆☆☆☆☆

آج ''پاکستان'' عرفان صدیقی سے محروم ہوگیا

میری پسندیدہ شخصیات میں سے ایک عرفان صدیقی بھی تھے، جنھیں پاکستان کی ایک ہمہ جہت اور بے پناہ صلاحیتوں کی مالک شخصیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ جو ایک اُستاد، ماہرِ تعلیم، مصنف، دانشور، نثر نگار، شاعر اور صاحب طرز کالم نگار تھے۔ ان کی پیدائش ۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو راولپنڈی میں ہوئی۔ وہ جماعتِ اسلامی کے مرحوم رہنما اور دانشور نعیم صدیقی کے بھانجے، اسلام آباد ہائیکورٹ کے سابق جسٹس شوکت عزیز صدیقی کے پھوپھی زاد تھے۔ چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف جنرل زبیر حیات، سابق آرمی چیف قمر جاوید باجوہ اور اعجاز الحق ان کے شاگردوں میں نمایاں ہیں۔ عرفان صدیقی بہت شریف النفس انسان تھے، شائستگی کا پیکر، اسلام دوست، قائد اور اقبال کے سچے عاشقوں میں سے ایک تھے۔ ان کی شخصیت اور ان کے حروف و بیان کے سحر میں ایک عالم گرفتار رہا، وہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے دلوں کو مسخر کرنے کے فن سے خوب آشنا تھے۔

عرفان صدیقی نے لاہور میں واقع پنجاب یونیورسٹی سے ''تعلیم و تربیت'' میں بیچلر اور اُردو زبان میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۶۳ء میں وفاقی تعلیمی اداروں میں مختلف سطح کی تعلیمی سرگرمیوں سے اپنی عملی زندگی میں قدم رکھا اور ۱۹۸۸ء میں سرکاری سروس سے رضاکارانہ ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا، ان کی سروس پچیس سال کے سنہری ادوار پر مشتمل تھی جن میں سے اٹھارہ سال ایف جی سرسید کالج راولپنڈی میں تدریسی خدمات کے شامل ہیں، جو آج بھی اعلیٰ تعلیم کا ایک بہت ہی مستند و معروف ادارہ ہے۔ جبکہ دو سال تعلیم کے سربراہ کے طور پر او ڈی ایف میں بھی کام کیا اس ادارے کو بیرون ممالک مقیم پاکستانی طلبہ کی خدمت کا سرکاری

صدام ساگر

ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے دو سال بعد انھوں نے نوے کی دہائی میں پیشہ ورانہ صحافت کا آغاز مضمون نویسی سے کیا، جن میں موجودہ عہد کے آبروئے صحافت مجیب الرحمٰن شامی کے ہفتہ وار ''زندگی''، ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' قابلِ ذکر ہیں۔ جبکہ ''اُمت'' اخبار کے بانی محمد صلاح الدین شہید کے ویکلی میگزین ''تکبیر'' سے بھی وابستہ رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ۱۹۹۷ء تک ''جنگ'' اخبار میں ''نقشِ خیال'' کے عنوان سے کالم بھی لکھتے رہے۔ ایک سال بعد انھیں صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ کا ''پریس سیکرٹری'' مقرر کر دیا گیا۔ جس کے بعد تقریباً وہ پیشہ ورانہ صحافت سے دور رہے۔ ۲۰۰۱ء میں انھوں نے روزنامہ ''پاکستان'' اسلام آباد کے ایڈیٹر کے طور پر دوبارہ سے صحافت میں قدم رکھا۔ مگر جلد ہی اس ادارے کو خیر آباد کہہ کر روزنامہ ''نوائے وقت'' سے وابستہ ہو گئے اور ''نقشِ خیال'' کے عنوان سے کالم لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا پھر اگست ۲۰۰۸ء میں یہاں سے دوبارہ ''جنگ'' اخبار سے وابستگی اختیار کر لی۔ جہاں انھوں نے سیاسی اور سماجی امور پر مسلسل کالم لکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف ٹاک شوز میں بطور مہمان بھی شرکت کرتے رہے۔

صدیقی صاحب سیاسی طور پر ایک قدامت پسند نظریات کے بھی حامل تھے اس لیے وہ اپنے کالموں میں افغانستان میں امریکی جنگ پر تنقید کے لیے زیادہ مقبول تھے۔

انھوں اپنی پیشہ وارانہ وابستگیوں کے دوران کئی بیرون ممالک کے سفر بھی کیے، خاص طور پر امریکا اور ایران میں انھیں سرکاری سطح پر مدعو بھی کیا گیا۔ سیاست، صحافت اور تعلیم کے موضوع پر ان کے پاکستان اور بیرون ممالک میں کئی لیکچرز بھی ہوئے نمایاں کالم نگار کی حیثیت سے ان کو پاکستان سمیت دنیا بھر دیگر ممالک میں کئی ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔

نواز شریف کے تیسرے دورِ حکومت میں ان کو وزیرِ اعظم کا مشیر برائے قومی تاریخ وادبی ورثہ مقرر کیا گیا جس کے بعد انھوں نے قومی اخبارات کے لیے کالم لکھنے کا سلسلہ ترک کر دیا۔ نواز شریف کی تقاریر بھی عرفان صدیقی لکھا کرتے تھے، اسی زمانے میں ان کے بھائی ڈاکٹر شاہد صدیقی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

عرفان صدیقی پاکستان کے ایسے روشن چراغ کی مانند تھے جو محض روشنی نہیں بلکہ ذہنوں میں آگہی کے دیپ روشن کیے، مردہ ضمیروں کو اپنی تحریروں اور تقریروں سے جگایا یہی وجہ ہے کہ ان کے الفاظ آج بھی بہت سے ذہنوں اور دلوں پر نقش بن کر رہ گئے ہیں۔

صدیقی صاحب ایک ماہرِ تعلیم ہی نہیں تھے وہ ایک مکتب تھے، ایک چلتی ہوئی تاریخ، ایک مہربان اُستاد تھے جو ہر لفظ میں محبت، ہر دلیل

میں سچائی اور ہر جملے میں تہذیب کی خوشبو لیے ہوئے تھے۔ ان کے قریبی دوست جلیل عالی بتاتے ہیں کہ "میرے مشاہدے کے مطابق وہ بہت ہی ذہین اور بہت ہی اچھے اُستاد تھے، وہ دوسروں تک علم پہنچانے کے مرتبے پر فائز تھے، ان کی ہینڈ رائٹنگ بہت اچھی تھی وہ نوجوان طالب علموں سے مل کر بہت خوش ہوتے، وہ اپنی باتیں اور خیالات دوسروں کے ذہنوں میں اُتارتے تھے۔ یہ صلاحیت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں جو کچھ وہ جانتے ہو اور دوسروں تک پہنچائیں۔ ایک اُن میں خوبی میں نے یہ دیکھی کہ تقریر لکھنے میں جیسے کسی وزیر اعظم یا صدر کی کسی زمانے میں لکھتے وہ اسی انداز سے کالج میں جب بھی کوئی پروگرام ہوتا تو کسی مہمان یا پرنسپل کی تقریر وہ بلکل قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ رشید امجد بھی تھے اور میں بھی اور بھی اس لوگ تھے ہم سوچتے کہ تقریر لکھنے کا کام صرف عرفان صدیقی کو ہی سونپا جائیں۔ اس طرح وہ ریڈیوں کے لیے ڈرامے بھی لکھتے۔ ڈراما اس طرح لکھتے ہم دھوپ میں کالج کے برانڈے میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے ہوتے وہ ہمارے ساتھ باتیں بھی کرتے ساتھ ڈراما بھی لکھ لیتے۔ صدیقی صاحب اپنی فکری، تہذیبی روایات سے منسلک آدمی تھے، ذاتی طور پر اپنی اسلامی، فکری تہذیبی روایت سے ایک بہت ہی فال اور متحرک دانشور تھے۔"

عرفان صدیقی نے ریڈیو پاکستان میں متکلم، فیچر رائٹر اور ڈراما نگار بھی رہے اور سو سے زائد ایسے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے جنھیں عام عوام اور دانشوروں کی طرف سے وسیع پیمانے پر سراہا گیا انھی میں سے ایک مشہور اُردو ڈراما "اشفاق احمد اور مرزا ادیب" بھی شامل ہے۔ ان کے کالموں پر مشتمل کتاب "صدیقی اردو کالم" کو، ادبی اور صحافتی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔ صدیقی صاحب جتنے باکمال اور ہنر مند شاعر تھے بطور شاعر انہیں ادبی حلقوں میں وہ شہرت نہ مل سکی اور یوں نسل نو ان کی شخصیت کے اس پہلو سے بالکل ہی بے خبر ہے۔ انھوں نے اپنے چاہنے والوں کے اصرار پر اپنا شعری مجموعہ "گریز پا موسموں کی خوشبو" کے نام سے پبلش کروایا۔ جسے اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام ادبی حلقوں میں متعارف کروایا گیا۔ اس تقریب کے دوران افتخار عارف بتاتے ہیں کہ "ان کی شعری مجموعے کا حصہ اول نظموں پر مشتمل ہے یہ نظمیں ایک کہانی بیان کرتی ہیں جو محبت کے سارے موسموں پر محیط ہے۔ جذبے کی شدت اور احساس کا وفور پہلے مصرعے سے آخری تک، عہد و پیمان کے مہربان موسموں سے ہجر و فراق کے الم انگیز زمانوں تک، سارا ماحول افسانہ در افسانہ بیان ہوا ہے۔ غزلوں کا غالب مزاج احتجاج، اضطراب اور مزاحمت کا ہے، جو اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں کے حالات

پر تشویش اور اس ظلم و جبر کے خلاف جدو جہد کے جذبے کے ساتھ اس بے لحاظ و بے مہر نظام کی آئینہ دار ہیں۔ جبکہ نظموں کی فضا میرا جی، مجاز اور ساحر کی ترقی پسند روایت سے جڑی ہے۔ ''انھوں نے اپنے شعری اسلوب میں فکر و فلسفے کی موشگافیوں اور حکمت و دانش کی نکتہ آفرینیوں سے دور تک کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بنی نوع انسان کے ازلی و ابدی مسائل کا کرب، اپنے وقت کی رعونتوں کے خلاف برسرِ پیکار جری سپاہیوں کو خراجِ تحسین اور شہری بندۂ مزدور کے تلخ اوقات کی نوحہ گری کو بیان کیا ہے بلکہ ان کی شاعری میں بنیادی طور پر ہمیں خوابوں، رنگوں، خوشبوؤں، تتلیوں اور جگنوؤں سے سجے خیالات ملتے ہیں۔ اپنی شاعری کے حوالے سے انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ''میری شاعری کسی قومی، بین الاقوامی یا آفاقی انسانی مسئلے سے کم کم ہی واسطہ رکھتی ہے۔'' ان کے شعری مجموعے ''گریز پا موسموں کی خوشبو'' کے فلیپ میں عطاالحق قاسمی کچھ اس طرح سے رقم طراز ہے کہ ''میرا شمار عرفان صدیقی کے لاکھوں 'فینز' میں ہوتا ہے مگر اُن کی شاعری پڑھ کے میں ان کا فین نہیں رہا، ان کا مرید ہو گیا ہوں۔''

عرفان صدیقی کو عمران خان کے دورِ حکومت میں اسیری کے دن بھی کاٹنے پڑے۔ اس دوران ان کے کتاب ''قلم کو ہتھکڑی'' بھی منظرِ عام پر آئی جس کو مرتب حافظ شفیق کاشف نے کیا۔ صدیقی صاحب کی پراسرار رہائی پر ملک کے نامور اہلِ قلم اور اہلِ دانش کے تاثرات پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز مانا جاتا ہے۔ سجاد میر کے بقول ''عرفان صدیقی نے اپنا فرض نبھایا ہے اور اب یہ ہتھکڑیاں لگی تصویر تاریخ میں امر ہو گئی ہے۔'' عرفان صدیقی کی علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی خدمات اور قومی بصیرت کو آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ رہے گی۔ انھوں نے ہر موقع پر مثبت سوچ اور علمی دیانت کی بنیاد پر رہنمائی کی۔ ان کی ادبی، علمی، صحافتی خدمات کا سرکاری سطح پر اعتراف کرتے ہوئے ۲۰۱۴ء میں ''ہلالِ امتیاز'' سے بھی نوازا گیا۔ ان کی وفات گیارہ نومبر ۲۰۲۵ء کے طلوعِ آفتاب کے وقت راولپنڈی میں ہوئی۔ جس سے علمی دنیا کے لیے اور معاشرے کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔ آج پاکستان ایک سنجیدہ مفکر، معلم اور اصول پسند دانشور، عمدہ شاعر سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے۔ آخر میں اشک بار آنکھوں اور افسردہ دل کے ساتھ ان کی غزل سے دو اشعار پیش کرتا چلوں کہ:

زیست ہم فقیروں کی یوں گزرتی رہتی ہے
دل دھڑکتا رہتا ہے، سانس چلتی رہتی ہے
شاید ایک دو دن کی زندگی بھی مل جائے
بس اسی بھروسے سے عمر کٹتی رہتی ہے

☆☆☆☆☆

روح سے بغاوت: اہلِ قلم میں خودکشی کا رجحان

یوتھینیزیا یا مرسی کلنگ یا سہل مرگی ایک متنازعہ مسئلہ رہا ہے۔ سادہ ترین الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مریض جو کسی مہلک بیماری کے آخری مراحل میں ہوں، وہ اپنی رضامندی سے تڑپ تڑپ کر میڈیکل اخراجات کا بھاری بوجھ اپنے لواحقین پر ڈالتے ہوئے مرنے کے بجائے آسانی سے جلد مرنے کی اجازت اپنے معالج کو دے دیں یا خود چپکے سے ایسا کر لیں تو اسے یوتھینیزیا کہتے ہیں۔ بالفاظ دگر جب ان کا جسم روح کے خلاف باغیانہ رویے کی آخری حدیں چھونے کو تیار ہو جائے ۔ اردو میں اس کے ممکنہ متبادل آسان مرگی یا سہل مرگی ہیں جو رواج نہ پا سکے۔ میڈیکل حلقوں میں یہ قضیہ خاصا پرانا ہے۔ 1990 کی دہائی میں ایک امریکی ڈاکٹر جیک کیوورکین نے ”ڈیتھ مشین“ نامی ایک مہلک انجکشن اور ”مرسی مشین“ کے نام سے ایک زہریلا گیس ماسک متعارف کرائے تھے جو بسترِ مرگ پر پڑے مریض کو جوفِ مرگ میں لے جاتے تھے۔ اپنے کام کی مناسبت سے ڈاکٹر کا نام بھی ڈاکٹر ڈیتھ پڑ گیا تھا۔ تاہم کچھ عرصے بعد ہی امریکی حکومت نے ان رحم دلانہ قاتل آلات پر پابندی لگا کر بے چارے ڈاکٹر پر کئی مقدمے چلا دیے تھے۔

پچھلے دنوں ایک پولیس افسر کی اسلام آباد میں خودکشی کی خبر پڑھ کر ذہن میں گویا دبستانِ یوتھینیزیا سا کھل گیا اور وہ شعرا و ادبا یاد آنے لگے جنھوں نے مختلف وجوہ کی بنا پر خودکشی کا مشکل رستہ چنا۔ کافی سوچ بچار کے بعد خودکشی کرنے والے صاحبانِ علم و دانش کے لیے بھی یہی اصطلاح موزوں لگی کہ ان لوگوں کو اپنے حالات کی تاریک سرنگ کے اگلے سرے پر بھی مزید گمبھیر اندھیرا دکھائی دیتا ہے اور

افتخار الحق

اس بظاہر نہ ختم ہونے والی تکلیف سے نجات انھیں بدقسمتی سے خودکشی کی صورت ہی دکھائی دیتی ہے۔ یہ تجزیاتی عنصر ذہن میں رکھ کر خود کو اس پراسرار اور وحشت انگیز عمل کے موضوع پر لکھنے کے لیے آمادہ کرنا پڑا۔ اگرچہ یوتھینیزیا میں موت کا عمل آسان اور غیر تکلیف دہ کیا جاتا ہے جب کہ ہمارے شاعروں / ادیبوں نے اکثر بہت تکلیف دہ طریقہ منتخب کیا لیکن شاید انھوں نے:

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

....

کی توجیہہ اپنے انداز میں کرتے ہوئے بدن کو روح کے خلاف بغاوت کو جائز گردانا ہو۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ساحر لدھیانوی کا نام ذہن میں ابھرا۔ ساحر کی شاہکار نظم "خودکشی سے پہلے" کا ایسے میں یاد آنا ایک فطری عمل ہے جب خودکشی کی صورت کسی زندگی کی غیر طبعی انداز میں کی انتہا کی اطلاع موصول ہوتی ہے۔ اس نظم کے مفہوم کی شدت ایسے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے جب کسی اہم شخصیت کی خودکشی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ پوری نظم پڑھ کر تو لگتا ہے جیسے ساحر نے اپنے تخیل کی سحر کاری سے گویا خودکشی کرنے والی شخصیت کے ذہن کا سی ٹی سکین کر کے اس کی منظوم رپورٹ اس زمانے میں شائع کر دی جب صرف ایکس رے ہی بہت بڑی تشخیصی توپ کا درجہ رکھتا تھا۔ اعلیٰ معیار کے ہر شاعر کو یہی الہامی صلاحیت اسے عام افراد سے ممتاز کرتی ہے۔

یوں تو ہر انسانی جان یکساں طور پر محترم اور وقیع ہوتی ہے لیکن اہلِ قلم اور خاص طور پر اربابِ سخن ہماری انفرادی و سماجی فکر و عمل پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک پارس کی طرح ہوتے ہیں جن کے فیض سے نجانے کتنے ہی باشعور افراد کی خفتہ تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ فیض نے اگرچہ طرزِ ملیح سے کام لیا ہے لیکن اس شعر میں کچھ ایسے ہی امر کی طرف اشارہ ہے:

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

....

سو ایسے افراد کی خودکشی لامحالہ متعدد سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس بابت دلچسپ، اہم اور تشویشناک بات یہ ہے کہ اپنی جان لینے کے واقعات کا تناسب نثر نگاروں کی نسبت شعرا میں قدرے زیادہ ہے گو اسے اصول نہیں بنایا جا سکتا

کہ ہمیشہ شعرا کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے یا خدانخواستہ رہے گی۔ غیر طبعی موت کی ہر شکل بہت بھیانک ہوتی ہے اور خود کشی صرف بھیانک ہی نہیں ہوتی بلکہ زندہ انسانوں میں ایک ناخوشگوار تجسس بھی ابھارتی ہے۔ اردو شاعری میں شاید اسی ناخوشگوار بلکہ ہیبت ناک عنصر کے سبب یہ موضوع نہ کبھی مقبولیت پا سکا اور نہ اسے شعرا کی اکثریت نے اسے اپنی ترجیح ہی بنایا۔ بایں ہمہ فلموں، ڈراموں، سنسنی خیز فکشن اور شاعری میں یہ موضوع کسی طرح در ہی آتا ہے اور کہیں نہ کہیں مصنف/شاعر کی قوتِ متخیلہ کو اس موضوع کا خام مال یا تو اپنے گرد پھیلی بے رحم دنیا سے دستیاب ہوتا ہے یا پھر اس کی اپنی ذات کے ماضی/ حال سے جڑے تلخ تجربات اسے یہ مواد فراہم کر دیتے ہیں۔ مثلاً ثروت حسین نے جب یہ شعر لکھا تو شاید اس وقت تک ان کا ذہن کسی طویل پس منظر کے سبب خودکشی کے لیے مکمل طور پر تیار ہو چکا تھا:

موت کے درندے میں اک کشش تو ہے ثروت
لوگ کچھ بھی کہتے ہوں خودکشی کے بارے میں

....

ثروت حسین کے علاوہ شکیب جلالی، سارہ شگفتہ، آنس معین اور مصطفےٰ زیدی اس دہلا دینے والے موضوع کے کچھ اور نمایاں ناموں میں شامل ہیں۔ تاہم اہلِ قلم کے ساتھ کچھ عرصے سے سول سروسز کی خودکشی کی خبروں کی تعداد تشویشناک حد تک بڑھنے سے بھی کئی سوالات عوام وخواص کے ذہنوں میں جنم لینے لگے ہیں۔ ان سوالات کے کچھ جواب تو لوگ مفروضوں کی شکل میں دینے لگتے ہیں جب کہ کچھ اور حساس اذہان ایک طویل خاموشی کے دریا میں اتر جاتے ہیں۔ متذکرہ بالا شعرا میں ایک قدرِ مشترک یہ دیکھی گئی کہ ان میں سے بیشتر نے اس حتمی فیصلے سے پہلے اشارتاً یا براہِ راست اپنے اشعار میں خودکشی کو منظوم یا مذکور کیا ہے۔ شکیب جلالی کا یہ شعر نہ صرف بے حد مقبول ہوا بلکہ ان کی زندگی کے آخری ایام کی شناخت بھی بنتا چلا گیا:

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

....

اس سانحے کے تسلسل میں ایک اور دردناک پہلو یہ ہے کہ موت کے بعد ان کی جیب سے یہ شعر برآمد ہوا تھا:

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتا بھی دیکھ

اردو اور پنجابی کی شاعرہ سارہ شگفتہ کے کلام میں ایسے اشارے واضح ہیں جن سے ان کے خودکشی کی طرف رجحان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں:

موت کی تلاشی مت لو
انسان سے پہلے موت زندہ تھی
ٹوٹنے والے زمین پر رہ گئے
میں پیڑ سے گرا سایہ ہوں
آواز سے پہلے گھٹ نہیں سکتی
میرے ہاتھوں میں کوئی دل مر گیا ہے

....

ان کی ایک نظم کے یہ دو مصرعے غالباً اس وقت کی تخلیق ہیں جب انھوں نے اس شاہراہ پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس سے نہ مڑ کر دیکھنا ممکن تھا اور نہ مڑ کر واپسی کا سفر کرنا:

میں مر رہی ہوں پر دیکھنا
اور کوئی سارہ نہ بنے

....

آنس معین کا غالباً آخری ایام عمر کا یہ شعر بھی ان کی دل بیتی کے ابواب کا خلاصہ بنا بہت کچھ بتا رہا ہے:

نہ تھی زمین میں وسعت مری نظر جیسی
بدن تھکا بھی نہیں اور سفر تمام ہوا

....

احسن فارقلیط نے نثر نگاری کا انتخاب کر کے اپنی پہچان بنائی اور اپنے آخری ایام میں کسی تنقیدی نشست میں خودکشی کا موضوع چھڑا تو انھوں نے خودکشی کا دفاع کرتے ہوئے ایک عربی مقولے کا ترجمہ پیش کیا تھا:

''زندگی بوجھ بن جائے تو باقی ماندہ سانسیں عزرائیل کے منہ پر دے مارو۔''

ان تمام مثالوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے سب سے پہلے تو ہمیں خودکشی جیسے ہولناک عمل کا نفسیاتی جائزہ لینا ہوگا۔ انسانی نفسیات کی غیر مرئی گرہیں نہایت پیچیدگی کے ساتھ دماغ کے ان نہاں خانوں میں کھلتی اور لگتی رہتی ہیں جو ذہن نامی نادیدہ حصے میں ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ دماغ کو ہم ہارڈ ویر اور ذہن کو سافٹ ویر کہہ کر انسانی کھوپڑی میں مقفل اس اہم ترین عضوِ جسمانی پر بات کر سکتے ہیں۔ اب میڈیکل سائنس نے دماغ کے کئی افعال دماغی خلیات / نیورانز کی ساخت و کارکردگی کے مطالعے اور ان کے مابین کیمیائی تعاملات اور برقی رو میں اتار چڑھاؤ کی صورت سمجھ تو لیے ہیں لیکن انسان کو اشرف المخلوقات بنانے والا یہ پراسرار عضو ابھی پوری طرح سمجھ نہیں آیا ہے۔ نجانے کتنے ہی کیمیائی تعاملات / کیمیکل ری ایکشنز ہمارے معمول کے فکری عمل کے لیے درکار ہوتے ہیں اور ان

کیمیکل ری ایکشنز کی تعداد اور دماغی برقی رو کی رفتار میں اس وقت جانے کتنا اضافہ ہو جاتا ہوگا جب انسان شدید ذہنی دباؤ کے تحت قتل یا خودکشی جیسے انتہائی اقدام کے لیے خود کو آمادہ کر رہا ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی قابلِ غور نکتہ ہے کہ اس ذہنی آمادگی کے پس منظر کا دورانیہ کتنا طویل ہوتا ہے کیونکہ اگر اس طرح کے ری ایکشنز پیک ہوا کرتے تو شاید ایسے سانحات کا تناسب کہیں زیادہ ہوتا۔ گویا بقول شاعر اس مفروضے کی صداقت کا بیانیہ کچھ یوں بنتا ہے:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

....

ایک اہم بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ دماغی برقی رو کی رفتار نابغہ روزگار/ جینیئس افراد اور مرگی کے مریضوں میں معمول سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یوں اس برقی رو اور کیمیائی تعامل میں غیر معمولی نوعیت کے کسی خاص رشتے کا ہونا بھی خودکشی کی سائنسی توجیہات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ میڈیکل سائنس کے مطابق خودکشی کے ڈانڈے موروثی عناصر اور جینز/ Genes سے بھی ملتے ہیں۔ بہر حال اب تک کی تحقیق کی روشنی میں کوئی ایسے مخصوص جینز دریافت نہیں ہوئے جو صرف حساس افراد میں پائے جاتے ہوں اور جو بطورِ خاص خودکشی پر اکسانے کی صلاحیت رکھتے ہوں لیکن جس رفتار سے اس شعبے میں تحقیق جاری ہے، قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں اس بابت کچھ مختلف پیش رفت ہوتی دکھائی دے۔

ماہرینِ نفسیات کے مطابق خودکشی کرنے والے افراد رفتہ رفتہ اور اکثر اوقات غیر محسوس انداز میں سماجی علیحدگی/ سوشل آئسولیشن یا انتہا درجے کی تنہائی کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ خاص لمحہ جب وہ اس انتہا درجے کا قدم اٹھانے کو بالکل تیار ہوتے ہیں، اگر کوئی صاحب دانش واخلاص انھیں رفاقت کے وہ قیمتی ترین لمحات دے دے جن کی خودکشی پر مائل افراد کو ازل سے ضرورت رہی ہوتی ہے تو یہ لمحات اکسیر بلکہ تریاق کا کام کر سکتے ہیں اور اگر ایسا کرنے میں تاخیر ہو جائے تو:

پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

....

کی سی صورت پیدا ہونا ہی ناگزیر ہوتا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ ساحر نے اپنی یہ یادگار نظم کسی ذاتی تجربے یا مشاہدے

کے نتیجے میں لکھی ہو کیونکہ نظم کے کچھ مشتملات کی ایک جھلک دیکھنے پر یہی گمان گزرتا ہے:

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیے
آج میں موت کے غاروں میں اتر جاؤں گا
اور دم توڑتی چھت کے دھوئیں کے ہم راہ
سرحد مرگ مسلسل سے گزر جاؤں گا

....

گویا ایک طرف گرم شب سرابوں کے دیے روشن ہیں تو دوسری طرف کوئی سرحدِ مرگ مسلسل سے گزرنے کو تیار ہے۔ تضادات کی یہ انتہائی صورت کسی بھی حساس دل کے تار جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔

قارئین کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ آنے والا وقت اپنے ساتھ مزید ذہنی دباؤ کا سامان اپنے ہم راہ لاتا ہے اور ذہنی دباؤ/ سٹریس نت نئی صورتوں میں سب پر حملہ آور ہونے کو تیار رہتا ہے۔ لوگوں کی اجتماعی نفسیات یہی ہے کہ وہ اپنے آس پاس مشکلات میں گھرے افراد کی مدد یا کم از کم ان سے ہمدردی کرنے کے بجائے یا تو تجاہلِ مجرمانہ کو ترجیح دیتے ہیں یا اس سے بھی بدتر حد تک جا کر ایسے افراد کی بابت سنسنی خیزی اور مبالغہ آرائی کے مسالوں سے لطف اٹھاتے ہیں:

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں

....

یہ بھی واضح رہے کہ اعلیٰ سرکاری مسند پر بیٹھے لوگوں کے اپنے مسائل ہوتے ہیں، ان کی داخلی دنیا لازم نہیں کہ ویسی ہی شاندار اور پرسکون ہو جیسی ہمیں ان کی ظاہری چمک سے محسوس ہوتا ہے۔ بقول مصطفےٰ زیدی:

مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسّم مرا ترجماں نہیں ہے

....

حال ہی میں ایک نہایت معروف اور کامیاب اداکارہ کے اچانک مریضۂ دل بننے کی خبریں سوشل میڈیا پر گردش کرتی پائی گئیں۔ بظاہر اس اداکارہ کی زندگی کامیابیوں سے معمور ہے لیکن:

کون دلاں دیاں جانے ھُو

....

ہم معاشرتی چیلنجز اور مشکلات سے بھرپور دور میں جی رہے ہیں، اس میں شاید بڑے سے بڑے عہدے پر براجمان افراد اور اہلِ قلم بہت سے ذاتی مسائل سے نمٹتے ہوئے انھیں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے الجھا بیٹھتے ہیں اور یوں وہ ایک اتھاہ گہرائی کی کھائی میں

اندرونی طور پر گرتے چلے جاتے ہیں جہاں ایک وحشت ناک خاموشی اور قاتل تنہائی ان کی منتظر ہوتی ہے۔ اہلِ نظم و نثر تو ویسے بھی بے حد حساس قوتِ مشاہدہ رکھتے ہیں اور ان کے ذہن میں اپنے ماحول سے شدید ہوتی ہوئی عدم مطابقت کی صورت میں خلفشار پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ شاعر جبلی طور پر ایک اندرونی آہنگ اور تنظیم کے حامل ہوتے ہیں اور یہی آہنگ ان کی تخلیقی فکر اظہار کی بہترین صورت میں شعری قالب میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تخلیقیت اور تخلیقی جوہر ایک ایسا سمندر ہے جس کی گہرائی کا تعین تقریباً ناممکن ہے۔ عین ممکن ہے جب ایک بہت خلاق اور اتنا ہی حساس ذہن جب اپنے ماحول سے تعامل میں غیر معمولی عدم توازن اور عدم مطابقت کا مسلسل مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے لاشعور کا آزاد پرندہ منفیت کی زمین سے شوگر کوٹڈ دانے اٹھا کر گاہ بہ گاہ شعور کی اجازت کے بغیر اور اسے لاعلم رکھتے ہوئے اس کی شریانوں میں ڈالتا جاتا ہے۔ ادھر تخلیق کار کا دل اس تخریب کاری کے جال میں کچھ محسوس اور کچھ غیر محسوس طریقے سے پھنستا چلا جاتا ہے۔ گویا اس مقام پر فکر، جینز اور ماحول کا ایک کیمیائی مرکب سا بنتا چلا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی مخلص دوست یا رہنما مل جائے اور وہ ان پیچیدہ گتھیوں کو نہ صرف سمجھنے بلکہ کھولنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو تو پانسہ پلٹ سکتا ہے اور نہایت مشاقی سے ممکنہ خودکش لکھاری کو اس دلدل سے کھینچ کر نکالا جا سکتا ہے۔ یوں دنیائے ادب کسی سانحے کے بجائے معجزے کی خوشگوار خبر کا نظارہ کر سکتی ہے۔ سو ایک مضبوط مفروضہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ غیر معمولی حد تک حساس شاعر/نگار کے لیے تنہائی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ تنہائی کے مہلک وار کو روکنا نہ صرف ایسے زودحس افراد کے احباب بلکہ پورے معاشرے کا منطقی، اخلاقی اور اجتماعی فریضہ بن جاتا ہے۔

اس معاملے کا ایک بہت اہم پہلو معاشی اور سماجی عوامل ہیں۔ خودکشی کے مرتکب بیشتر افراد معاشی مشکلات کا شکار رہے ہیں یا معاشرے میں موجود کچھ ایسی شخصیات کے فکری نظام سے بری طرح متاثر ہوتے رہے ہیں۔ مصطفیٰ زیدی کو استثنائی تناظر میں دیکھنا ہوگا کہ وہ تو سول سروسز کا ایک معتبر نام تھے اور ان کی خودکشی کے محرکات اور پس پردہ عناصر خاصے مختلف تھے۔ تاہم ان کے کلام میں

کہیں کہیں اس خوف ناک عمل کا نقارہ سنائی دے جاتا ہے:

بگڑ چلا ہے بہت رسمِ خودکشی کا چلن
ڈرانے والو کسی روز کر دکھاؤ بھی

....

سارہ شگفتہ اور شکیب جلالی مالی مشکلات کے سبب خودکشی کی طرف مائل ہوئے۔ البتہ آنس معین کی بابت سنا ہے کہ پسند کی شادی نہ ہونے اور بینک کی ملازمت میں ایک مالی سکینڈل کا شکار ہونے کے سبب اس منفی عمل کے لیے مجبور ہوئے۔ پھر تصوف سے رغبت کے سبب شاید ان کے کسی مرشد نما رہنما نے کبھی یہ کہا تھا کہ اگر لوگوں کو آخرت کی دنیا کی پرکشش جھلک دکھا دی جائے تو دنیا کی نصف آبادی خودکشی کر لے۔ یہ بظاہر خلاف واقعہ لگتا ہے کیونکہ شریعت اور طریقت دونوں ہی کے رہنما خودکشی کو حرام قرار دینے میں متامل نہیں ہوتے۔ ایک امکان رہ جاتا ہے اور وہ ہے منصور حلاج کا فلسفۂ اناالحق۔ ممکن ہے آنس معین نے تصوف کے اس عدسے سے اپنی زندگی کو دیکھ کر کچھ ایسا نتیجہ اخذ کیا ہو جو جان لیوا ثابت ہوا۔ یہ بھی خارج از امکان نہیں کہ متعلقہ صوفی مرشد نے جانے کس تناظر میں بات کی اور آنس نے پوری بات کسی اور زاویے سے سنی اور سمجھی ہو۔ اسی لیے ان کے کلام میں جابجا اس زاویہ فکر کا عکس دکھائی دیتا ہے:

اندر کی دنیا سے ربط بڑھاؤ آنس
باہر کھلنے والی کھڑکی بند پڑی ہے

آخر کو روح توڑ ہی دے گی حصارِ جسم
کب تک اسیرِ خوشبو رہے گی گلاب میں

آج ڈوبتی دھڑکن کی صدا لوگ نہ سن لیں
کچھ دیر کو بجنے دو یہ شہنائی ذرا اور

....

ثروت حسین کے مالی مسائل کسی حد حل تو ہونے لگے تھے لیکن بری طرح نظر انداز ہونے کے سبب ڈپریشن کی انتہا ان کی زندگی کی انتہا بنتی گئی۔ احسن فارقلیط کا بھی مذہبی گھرانے سے تھا اور اچھے بھلے میڈیکل ڈاکٹر بننے کا عمل چھوڑ کر صحافت اور ادب سے وابستہ ہو گئے۔ ایک سے دوسرے شعبے میں جانا اتنی غیر معمولی بات بھی نہیں لیکن ٹرانزیشن کے اس دور کے بعد شاید کسی شدید پشیمانی کا دیمک اندر ہی اندر انھیں چاٹتا رہا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نئے شعبے میں کچھ مشاہدات ان پر شدت سے اثر انداز ہوتے رہے ہوں کیونکہ انھوں نے سٹیج پر اداکاری بھی کی۔ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب کوئی ماہرِ نفسیات کسی مریض کے علاج کے دوران مریض

سے ہی متاثر ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اس عمل کو ٹرانس فیوژن کہتے ہیں۔ سو ایک گمانِ غالب ہے کہ احسن فارقلیط نے اداکاری میں کسی مائل بہ خودکشی شخص / اشخاص کا کردار ادا کرتے ہوئے عملاً اسی کی طرز پر زندگی کو منفی زاویے سے دیکھتے چلے گئے ہوں۔ یعنی یہ بھی ٹرانس فیوژن کی ایک قسم ہو۔

ان تمام نکات سے یہ طے کرنا آسان ہے کہ اہلِ دانش و قلم کے ہاں خودکشی کا رجحان پوری طرح سمجھنا جہاں بہت گنجلک اور پراسرار ہے وہیں یہ ایک بہت طویل موضوع بھی ہے جو باقاعدہ مزید تحقیق کا طالب ہے تاکہ اس کے موثر اور بروقت تدارک کا انتظام کیا جا سکے۔ اس بابت پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا بہت مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہماری فلموں اور ڈراموں وغیرہ میں اس موضوع کو ہرگز اس انداز میں پیش نہیں کرنا چاہیے جس سے کسی کو بھی اس کی ترغیب ملنے کا عمل شروع ہو سکے۔ ٹی وی، لیپ ٹاپ اور موبائل سکرین پر دکھائے جانے والے مناظر ہر عمر اور شعبہ حیات کے افراد کے ذہنوں پر دیرپا اثرات نقش کرنے کی اہلیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح جنسی ہراسانی اور گھریلو تشدد کے خلاف باقاعدہ آگاہی کی مہم چلائی جا رہی ہے اور اس بابت قانون سازی کا عمل بھی جاری ہے، اسی طرح میڈیا پر لازم ہے کہ وہ خودکشی کو تشدد کی بدترین اور نہایت بزدلانہ شکل کے طور پر پیش کرے۔ اہلِ قلم کے تمام حلقوں کے اراکین کو اپنے احباب کے رویے میں کوئی بھی غیر معمولی منفی تبدیلی کی جھلک نظر آنے لگے تو فوراً ایسے احباب کے لیے تنہائی ختم کرنے کی انفرادی اور اجتماعی کوشش کرنی چاہیے کہ انسان جبلی طور پر سماجی جانور ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ انسان ہی یہ بنیادی سبق بھولنے کے درپے ہوا جا رہا ہے۔ شاید سب کو یاد ہی ہو کہ کرونا کے وبائی دور میں جب لاک ڈاؤن کی اذیت سے ہمیں گزرنا پڑا تھا تو کتنے ہی لوگ اس بیماری سے تو بچ گئے لیکن نفسیاتی عارضوں کی کوئی نہ کوئی شکل ان پر حملہ آور ہو ہی گئی تھی۔

اسی طرح قلم قبیلے کے ممبران کی معاشی مشکلات پر نظر رکھنا ہی کافی نہیں بلکہ حکومتی اور نجی سطح پر حسبِ استطاعت بروقت مالی اور اخلاقی معاونت کے لیے باقاعدہ ادارہ سازی بھی بہت اہم ہے۔ تاہم یہ بھی دھیان میں رہے کہ اس

احسن عمل کا مقصد کسی قسم کی ادبی گداگری کو فروغ دینا نہیں ہے بلکہ ان کے توسط سے کفیل احباب فراہم کردہ عطیات کے سرمایہ کارانہ استعمال کی تربیت مستحقین کو اس انداز میں دیں کہ بتدریج ایسے افراد خود کفالت کی منزل پانے کے قابل ہو جائیں۔ پھر اس تمام عمل میں متعلقہ افراد کی عزت نفس کو اولین ترجیح دینا بھی بے حد ضروری ہے۔ اسی طرح دینی تعلیمات کی متنازعہ تشریح سے متاثر ہوتے تخلیقی اذہان کے ساتھ باقاعدہ پیہم مکالمے کا اہتمام اس مذموم عمل کے مذہب سے غلط تعلق کی راہیں مسدود کرنے میں مددگار رہوگا۔ اس مقصد کے لیے ماہرینِ نفسیات سے کونسلنگ وغیرہ کی صورت امداد لینے کے پہلو کو ہرگز نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اب زمانہ اور فرسودہ طرزِ فکر بدلنے لگے ہیں اور انٹرنیٹ کی بدولت لوگوں میں یہ شعور بیدار ہونے لگا ہے کہ ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنے کا واحد مطلب صرف ذہنی مرض کالاحق ہونا نہیں بلکہ ان کی خدمات تو بڑے بڑے اداروں سے وابستہ اعلیٰ عہدوں پر متمکن افسران اور بڑی بڑی کاروباری شخصیات بھی لینے لگی ہیں۔ پھر بھی پاکستانی معاشرے کی مجموعی پس ماندگی اس کی متقاضی ہے کہ طرزِ کہن سے نکل کر آئینِ نو کی طرف قدم بڑھانے کی کچھ زیادہ اور منظم کاوش کی جائے اور توہمات کے طلسم کو توڑ کر جدید دور اور اس سے وابستہ چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے سائنسی طرزِ فکر کو فروغ دیا جائے۔

لکھاری تنظیموں پر لازم ہے کہ اس عمل کو صرف افسانوں وغیرہ کا موضوع بنانے پر اکتفا نہ کریں بلکہ قاری تک مثبت اور صحت مند پیغام کی ترسیل کا مقدس فریضہ انجام دینے پر بھی ممکنہ زاویوں سے غور کرنے کا سامان بہم کریں۔ ادبی بیٹھکوں، تنقیدی نشستوں اور دانش وروں کی غیر رسمی مجالس میں اس موضوع پر تبادلۂ خیال کو اس نیت سے فروغ دینا چاہیے کہ خودکشی سمیت تمام منفی رویوں کو کیسے تبدیل کیا جائے۔ زندگی کے گوناگوں شعبوں سے منسلک افراد سے اس بات رائے لی جائے اور ان کے مشاہدات و تجربات سے استفادے کی راہیں ڈھونڈی جائیں۔ یاد رکھیے بروقت حفاظتی اور پرہیزی اقدامات سے ہم ایسے ضرر رساں رجحانات کی بیخ کُنی کر سکتے ہیں اور یہ انسانیت کی خدمت کی ایک اور ارفع شکل ہوگی۔

☆☆☆☆☆

”اُجالے اپنی یادوں کے“ ــــ ایک مختصر تاثر

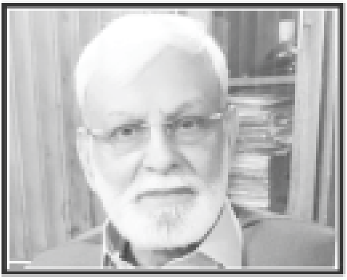

میں قبلہ پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری کو اُن کی تصنیف خاص: ”اُجالے اپنی یادوں کے“ کی اشاعت پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوب صورتی یہ ہے کہ اس میں جناب اظہار الحسن بخاری نے اپنی تمام یادداشتوں کو یک جا کر کے اپنی حسین یادوں کے روشن اور دلاویز اُجالوں کو اپنی زندگی سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اگر کہیں گھپ اندھیروں سے بھی گزرے تو خوب صورت یادوں کے اُجالوں نے اُن کا ہر راستہ روشن رکھا جس پر محوِ سفر رہ کر اُنھوں نے منزلِ زیست کو پایا۔

حیات کی ہر پگڈنڈی پہ چلتے ہوئے یادوں کے اُجالوں نے اُن کے دل و دماغ کو منور رکھا یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے نئی اُمنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ نئے دنوں کی مسافتوں کو اُجالتے ہوئے فنا میں بقا حاصل کرنے کا درسِ خاص ہر عام شخص تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔

پیش لفظ سے لے کر کتاب کے مضمون آخر تک یادوں کا ایک تسلسل ہے جو اُنھیں خود سے الگ تھلگ نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنی تحریروں میں کرب اور طرب، غم اور خوشی دونوں کیفیات کو ساتھ ساتھ رکھتے ہیں، اظہار الحسن صاحب کے مضامین پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے مَیں کوئی ٹیلی فلم دیکھ رہا ہوں اور اس فلم کا ہر کردار ایک داستان بن کر میرے سامنے کھڑا ہے اور ہر داستان میں اُس کا وجدان اُس کی ظاہری اور باطنی کیفیات سے جُڑا ایک ایسا گلدستہ ہے، جس میں سج کر ہر گُل تر اپنی جداگانہ رنگت اور منفرد خوشبو سے چمنستانِ ہستی کو مہکائے ہوئے ہے۔

پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری ایک ایسے مُعلم ہیں جو اپنے ہر متعلم کی خوبیوں اور اپنے ہم عصر اساتذہ کے اوصافِ جمیلہ سے بخوبی واقف ہیں، وہ علم و فن اور حُسن و جمال کا احاطہ کرنے کی خوب مہارت رکھتے ہیں، اُن کا ہُنر اُن کے قلم کو رعنائی خیال کے سارے رنگوں سے مرصع رکھتا ہے اور یہ سارے رنگ قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح آکاشِ علم و ادب پر رقصاں ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ۔

☆☆☆☆☆

نیّر سرحدی

”حرفِ التجا“ کے رنگ

نعت کا ہر شعر دراصل عقیدت و احترام کے جذبات سے پھوٹنے والا وہ ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے۔ جو اس دشت ہوتی زندگی میں روحوں کی پیاس بجھاتا ہے۔ اور دکھوں، غموں کی تمازتوں کو بے اثر کرنے کا زبردست کام سرانجام دیتا ہے۔ دن بدن بگڑتے ہوئے سیاسی، سماجی معاشی حالات ہمیں اس دور میں لے جا رہے ہیں۔ جس کے لیے آپ اسے دورِ جہالت کے نام سے عبارت کر سکتے ہیں۔ اور حالات جب مسلسل شر کی جانب گامزن ہوں۔ تو خیر کی قوتیں اللہ کے فضل و کرم کی علامت بن کر خاموشی سے تقویت پاتی رہتی ہیں۔ نعت نگاری بھی خیر کی ایسی قوت ہے۔ جو دلوں پر اپنا اثر ڈال کر کردار کی اصلاح کا اہم فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ نعت گو غیر شعوری طور پر بھی اپنے آپ کو ایسے روپ میں ڈھالنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ جو اس کے کلام سے قریب تر ہو۔ یہی وہ موڑ ہے جو زندگی کو صراطِ مستقیم پر لے جاتا ہے۔ نعت گوئی میں روز افزوں ترقی کردار میں بھی ارتقا کی ضامن بن جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اوصاف و اکرم رسولِ پاک کی جانب توجہ تا کہ خوب سے خوب تر نعت کہی جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر غزل گو شاعر بھی اب نعت کہہ رہے ہیں --- اور نعت کی برکتوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ کچھ یہی صورت حال ہمیں زیرِ نظر نعتیہ مجموعہ کلام ،،حرفِ التجا،، کے شاعر جناب مظہر امام کے بارے میں نظر آتی ہے۔ ان کا طبعی رجحان نعت کے لیے انتہائی موزوں نظر آتا ہے۔ اس سبب اب دن رات اٹھتے بیٹھتے درود پڑھتے رہنا اور نعت کہتے رہنا ان کا محبوب عمل بن گیا ہے۔ نعت کہنا یقیناً عبادت ہے۔ مگر عبادت میں بھی آسانی کبھی نہیں ہوتی۔ مثلاً نماز کو ہی لے لیجیے اور خاص طور پر سردیوں کی نماز جس کے وضو کے لیے بہت ہمت کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح روزہ اور خاص طور پر گرمیوں کا روزہ اپنی سختی کا احساس بہر طور دلاتا ہے۔ کلمہ گو کے لیے زندگی ایک امتحان سے کم نہیں۔ اسی طرح نعت کہنا بھی ایک امتحان ہے۔ اور یہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ جب تک کہ مالک

خالق آرزو

کی عطا نہ ہو۔ مصرعے تو ہر موزوں شاعر ترتیب دے سکتا ہے۔ مگر جسے شعر کہتے ہیں۔ وہ خونِ جگر اور مسلسل ریاضت سے ہی نمو پاتا ہے۔

حرفِ التجا کے شاعر نے جو حاضری اور حضوری کی کیفیات نظم کی ہیں اور ان میں جو بے ساختگی، والہانہ پن اور مستی کے اثرات ہیں۔ وہ خاص طور پر قابلِ رشک ہیں جو قاری کو بھی اپنے ساتھ اس سعادت میں شریک کر لیتے ہیں۔

مرے لفظوں کو میری سوچوں کو
مل گئے بال و پر مدینے میں

دل کے سارے ملال مٹ جائیں
وہ بلا لیں اگر مدینے میں

خوشبوؤں میں بسا رہے گا سدا
جو رہا لمحہ بھر مدینے میں

....

نعت کے اندر آپ کی سیرت کا بیان ایک روایت ہے۔ لیکن کے بعض پہلو ایسے ہیں۔ جو ایک عاشق کو ہی نصیب ہوتے ہیں۔ وہ سلسلہ در سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ انہی سلسلوں میں نعت لکھنا، نعت کہنا نعت سننا نعت سرائی کرنا سبھی شامل ہیں۔ چنانچہ جگر تب لہو ہوتا ہے۔ جب یادِ مصطفیٰ، ذکرِ مصطفیٰ آنکھوں میں روشن ستارے ابھارتی ہے۔ تو لمحے قبولیت و طمانیت کے ہوتے ہیں۔ تب یقین کی زبان سے مظہر امام یوں گویا ہوتے ہیں۔

خوف ہے نہ ڈر مدینے میں
ہیں شہِ بحر و بر مدینے میں

چشمِ نم کو نبی کی مدحت کا
مل گیا تھا ہنر مدینے میں

....

ہر گھڑی رکھتی ہے سرشار مجھے
نسبتِ سیدِ ابرار مجھے

میری سوچیں بھی منور ہو جائیں
ہوں عطا نعت کے اشعار مجھے

....

درِ حضور پہ جتنے بھی دن قیام کیا
درودِ پاک کا اشکوں سے اہتمام کیا

جہاں جہاں سے بھی گزرے ہیں رحمتِ عالم
ہر ایک راہ نے جھک کر انہیں سلام کیا

نبی کی مدحت سرائی کا فیض ہے سارا
زمانے بھر میں جس نے نیک نام کیا

....

نبی کے ذکر سے خوش کلام ہو گیا ہوں
میں دنیا بھر میں بڑا نیک نام ہو گیا ہوں

بڑے بڑے مجھے تکریم سے نوازتے ہیں
شہِ عرب کا میں جب سے غلام ہو گیا ہوں

میں اپنے آقا و مولا کی پاک نسبت سے
جہاں میں لائقِ صد احترام ہو گیا ہوں

....

جنابِ مظہر امام کی نعت کی ایک اور خوبی ہے۔ کہ وہ ہوش خرد کو کمالِ بے خودی کو بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ مشکل عمل ہے۔ جو عشاق کے دل میں وسوسے کی جگہ یقین کو مستحکم کرتا ہے۔ عصرِ حاضر میں حفیظ تائب کے ہاں اس اظہار کی بہت

خوب صورت مثالیں موجود ہیں اور ہمارے آج کے مظہر امام بھی اسی راہ کے راہی ہیں۔

اک تصور سے منسلک ہے امام
میری سوچوں کا باوضو ہونا

جس نے بخشا ہے شعور مدحت کا
یہ میری آگہی حضور سے ہے

اسے زندگی کا قرینہ ملا
سنی جس نے بھی گفتگوئے رسول

مظہر امام کیوں نہ ہو سرمایہ حیات
مجھ بے نوا کے واسطے مدحت حضور کی

کمال لوگ ہیں کیا اہتمام کرتے ہیں
جو آنسوؤں کو محمد کے نام کرتے ہیں

جب سے نعت آپکی کہنے لگا ہوں
عالم کیف میں رہنے لگا ہوں

یہ اعجاز چشم کرم کا ہے مظہر
اگر میں ذرا معتبر ہو گیا ہوں

فقط چاہتا ہوں گدائی نبی کی
نہ دولت نہ جاہ و حشم چاہتا ہوں

جناب رضا اللہ حیدر جناب مظہر امام کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ مظہر امام امریکہ میں مقیم ہیں۔ لیکن بقول علامہ اقبال جلوہ دانش فرہنگ ان کی آنکھوں کو خیرہ نہ کر سکا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ انھوں نے خاک مدینہ و نجف کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا رکھا ہے۔ اس لیے میں یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں کہ وہ جسمانی طور پر امریکہ میں رہتے ہیں۔ لیکن روحانی طور پر مدینہ طیبہ ان کا مسکن ہے۔ وہ ان خوش بختوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے تخیل اور تصور کی نعمت کو مثبت انداز میں استعمال کیا ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کہ حضور سید المرسلین کے تذکار جلیلہ میں سرشار رہتے ہیں۔ مدینہ منورہ کی پر نور فضاؤں اور زیارات مقدسہ کا احوال جزیات نگاری کے ساتھ کرتے ہیں۔ دیار حبیب خدا کا دیدار ان کے جذبات عقیدت و محبت کی تطہیر کرتا ہے۔ لیکن قلب و نظر کی تشنگی برقرار رہتی ہے۔ وہ تجلیات مدینہ میں گم رہنا اور فیض یاب ہونا پسند کرتے ہیں۔ ان کی اس شوق فرواں نے ان کے دل میں سوز و گداز اور آنکھوں میں نمی کی مسلسل برسات کی ہوئی ہے۔

اک تصور ہے میرے پیش نظر نعت کہتے ہوئے
قلب و جاں میں سمایا ہے انکا ور نعت کہتے ہوئے

دل کے ظلمت کدے میں اجالا ہوا آنکھ نم ہو گئی
اس طرح بھی ہوا اکثر و بیشتر نعت کہتے ہوئے

المختصر جناب مظہر امام نعت کی روشنی کو اپنے موئے قلم کا عنوان بنانے میں بے حد کامیاب رہے ہیں۔ آپ بھی یقیناً میری بات کی تائید کریں گے۔ خدائے بزرگ برتر طفیل محمد عربی دین و دنیا کی بھلائیوں سے سرفراز فرمائے۔

،،حرف التجا،، کے 176 صفحات ہیں - اس کا خوب صورت اور دیدہ زیب ٹائٹل دھنک مطبوعات لاہور نے بنایا اور شائع کیا ہے۔ حرف التجا کی نعتیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ حرف التجا اردو شاعری کے منظر نامے پر ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ یہ کتاب جناب مظہر امام کے اسلوب، فکر، شعری پختگی، جذبے اور شعوری ذوق کی آئینہ دار ہے۔ جو آنے والے دنوں میں ان کے مقام و مرتبے کو مزید مستحکم کرے گی۔

☆☆☆☆☆

ادھوری زندگی مکمل کردار

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا لکھا رہا ہوں میں

....

ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ بورخیس لکھتے ہیں ''میں اس لیے لکھتا ہوں تاکہ میں زندہ رہوں''۔ زیر بحث کتاب ''ادھوری زندگی مکمل کردار'' پروفیسر خالد نذیر صاحب کی پہلوٹھی کی کتاب ہے جو کچھ ماہ قبل منصۂ شہود پر آئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ پہلا بچہ اور پہلی شائع ہونے والی کتاب کی برابر نشاط و انبساط محسوس ہوتی ہے۔ اُستاد محترم پروفیسر خالد نذیر صاحب گورنمنٹ ایس ای کالج بہاولپور میں بطور مدرس اُردو فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ صادق عباس گریجوایٹ کالج ڈیرہ نواب صاحب (احمد پور شرقیہ) اور آج کل گورنمنٹ کالج علی پور میں درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ میری استادِ محترم سے بالمشافہ ملاقات تو نہیں ہوئی، مگر فیس بک کی دنیا اور اس سے پہلے میرے مہربان استادِ محترم پروفیسر حافظ جمشید احمد صاحب سے کلاس میں گاہے بہ گاہے ہر چند کا تذکرہ سنتا رہا۔ جس سے ان سے ملنے کی اُمنگ دل میں جاگی۔ ان سے ملاقات تو نہ ہو سکی مگر ابھی قریباً کچھ دن قبل میرے مہربان استاد محترم حافظ جمشید صاحب کے توسط سے بطور تحفہ یہ کتاب ''ادھوری زندگی مکمل کردار'' ان کے آٹوگراف کے ساتھ عطا ہوئی۔ جسے پڑھ کر نہ صرف ان کی فکری جہات بل کہ ادب دوستی کی پرتیں وا ہوئیں۔ اس کتاب میں مزکور کے اپنے زمانہ طالب علمی کی خوب صورت یادوں کی افسانوی رنگ دے کر امر کر دیا ہے۔

ورجینیا وولف کا کہنا ہے کہ ''کتابیں روح کا آئینہ ہیں''۔ میری یہ خواہش رہی ہے کہ ہر وہ کتاب جو مجھے جینا اور زندگی سے مکالمہ کرنا سکھاتی ہے، اسے ہر صورت پڑھ لینا چاہیے۔ میری سب سے بڑی خوشی کتاب لینا نہیں

منیر مانک

بل کہ وہ گھڑی انبساط کی ہوتی ہے جب ایک کتاب پڑھ کر مکمل کر لیتا ہوں۔ روح کو ایک چین سا محسوس ہوتا ہے۔ اب آتے ہیں زیر بحث کتاب کی جانب ادھوری زندگی مکمل کردار کتاب چودہ افسانوں، چودہ افسانچوں، تین نثرانے، اور سات انشائی مضامین پر مشتمل ہے۔ مصنف نے کتاب کا انتساب اپنے بچوں ایمان اور عبدالوہاب کے نام تحریر کیا ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب میں نے اپنے بچوں کے لیے لکھی اور شائع کی ہے۔ میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ میری زندگی کے بعد بھی میرے بچے مجھ سے جڑے رہیں"۔ زیرِ بحث کتاب کو پڑھ کر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کے ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا حسین پیراڈیم میں اظہار کیا گیا ہے ۔چودہ افسانوں میں شامل کچھ افسانے شعریات کے اعتبار سے بھرپور افسانوی فضا لیے ہوئے ہیں اور کچھ کمزور بیانیہ کہانی پر قائم ہیں افسانے جو بار بار پڑھنے کو من چاہتا ہے۔ جو اپنے اندر مکمل افسانوی رنگ لیے ہوئے ہیں ۔اس کتاب کا دوسرا افسانہ "ڈرپوک" ایک ایسے نوجوان کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو محبت اور حسن کی تشنگی تو دل میں رکھتا ہے، مگر اس محبت کا اظہار کرنے سے عاری ہے ۔ چند کے تعلق بنانے کو اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہوئے محبت جیسے حسین خواب کو دل میں پال لیتا ہے۔ مگر جب اظہار کرنے کا وقت آتا ہے تو احساس کمتری کا شکار ہوتے ہوئے پہلوتہی سے کام لیتا ہے۔

اقتباس:

شاہد: اچھا یہ تو بتاؤ تمھارے نزدیک محبت کے کیا معنی ہیں؟

صدف: پتا نہیں---- مگر سیانے کہتے ہیں۔ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ لہٰذا تم بتاؤ محبت کا تضاد کسے کہتے ہیں۔

شاہد: برجستگی سے کہتا ہے-- نفرت

صدف نے گہرا سانس لیا اور کہا

نہیں پگلے محبت کا تضاد نفرت نہیں----- بل کہ خوف ہے۔

کتاب کا دوسرا افسانہ "راول روہی" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔اسے پڑھ کر روہی دامان، چولستان کے سفر کی کارگزاری محسوس ہوتی ہے۔روہی ایک ویرانے اور یاد کا استعارہ بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس میں مختلف چیزوں سے وابستہ یادوں کو بڑے خوب صورت اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

"ریشمی اور رنگین دھاگوں سے سجی ملبوسات میں روہی کی نازک جٹیاں، مٹی سے بنی گھاگروں میں دودھ بلوتے اور مکھن نکالتے ہوئے نظر آنے لگیں"۔ لفظوں کو بصارت کا روپ دے کر قابل دید منظر کشی کی گئی ہے جس میں روہی اور اس میں رہنے والوں کی زندگی آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتی ہے۔

تیسرا افسانہ "سائبان" کے نام سے لکھا ہے۔ یہ افسانہ اپنے عنوان کے ساتھ مکمل انصاف کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ماں جو ممتا اور محبت کا استعارہ ہے۔ جسے منفرد انداز میں تحریر کر کے ایک ماں کا اپنی اولاد بے انتہا محبت کو پرتاثیر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں کچھ ایسے واقعات دیے گئے ہیں، جنھیں پڑھ کر ماں جیسے نرم خو عظیم رشتے کی حساسیت کے بارے غور طلب باتیں ملتی ہیں۔ وہ احساس اور مروت جو ایک نوجوان اپنی جوانی کے خمار میں پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اس افسانے کو پڑھنے کے بعد اس عظیم رشتے کی حساسیت کا ادراک ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں شامل مضامین کی بات کی جائے تو سارے مضامین اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مصنف کی وسیع علمی بصارت کا ثبوت ہے کہ کیسے کیسے خوب صورت جملوں کا استعمال کرتے ہیں۔ خالد نذیر صاحب کے فن کی یہ خوبی ہے کہ بات مختصر مگر جامع انداز میں کرتے ہیں جو عام قاری بھی با آسانی سمجھ جاتا ہے۔

"وہ جو بیچتے تھے دوائے دل" مضمون پڑھ کر ایک حساس دل قاری خود پر ضبط نہیں کر سکتا کہ ہمارا بچپن کیسے گزرا، جیسے اب بھی کچھ جگہیں ایسی ہوتی ہیں۔ جہاں سے گزرتے ہوئے وقت، گھڑیاں اور لمحات ایک دم اپنے ماضی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ ٹائم اینڈ سپیس کا خلا ختم ہوا، اور وقت واپس انھی لمحوں کی تازگی محسوس کرا دیتا ہے۔ اور اندر کی آنکھ گزرے لمحوں کی سیر کو چلی جاتی ہے۔ پھر ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کاش وہ لمحے ایک بار پھر میسر آ جائیں۔ تو اس طرح استاد محترم خالد نذیر صاحب نے بھی اس مضمون میں ایسے جملے ادا کیے ہیں:

"بچو! جانتے ہو ہم جماعت دوست آپس میں ماں جائے کی طرح ہوتے ہیں۔ تم لوگوں کا سکول میں یہ آخری سال ہے۔ تم خود چلے جاؤ گے مگر یہ تیرا، چودہ سال کا لڑکا جو اس وقت یہاں میرے سامنے ہے، یہیں رہے گا"۔ یہ جملہ ایک استاد ہی ادا کر سکتا ہے۔ جو اس کائنات میں والد کے بعد واحد ہستی ہوتا ہے جو خود سے بڑھ کر اپنے طالب علم کو ترقی کے زینے پر دیکھنا چاہتا ہے۔

اگر اس کتاب کے اسلوب کے بارے بات کی جائے تو معروف فرانسیسی ادیب ڈاکٹر بوفان کہتے ہیں "اسلوب خود انسان ہے" اس طرح خالد نذیر صاحب کے ایک ایک جملے میں ان کی شخصیت جھلک دکھائی دیتی ہے۔ رواں، سلیس اور شستہ اُردو کا استعمال ان کی پہچان ہے۔

آخر میں اس کتاب کے بارے صرف اتنا عرض کروں گا کہ نہ صرف پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھنے کو من چاہتا ہے بل کہ دعوت فکر بھی دیتی ہے۔ جیسے مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "یہ کتاب میرے بچوں کے لیے ایک یادگار، میرے دوستوں کے لیے ایک تحفہ اور قارئین کے لیے دعوت فکر ہے۔"

☆☆☆☆☆

حلقۂ دامِ خیال [سفرنامہ] [بقیہ حصہ]

اکثر مقام پر پیرس کی ٹریفک بمپر ٹو بمپر ہے آپ اگر کسی جگہ مڑنا بھول گئے تو پھر لمبے راستے سے اُس مقام تک پہنچنا پڑے گا فیصل بیٹے کی بیوی نایاب نے ایک جگہ سے کچھ خریدنا تھا چونکہ وہاں گاڑی پارک کرنے کی جگہ نہ تھی اُس نے کہا کسی نزدیکی جگہ پر پارکنگ کر لینا میں فون کر کے بلالوں گی۔ گاڑی وہاں سے چلی تو فوراً ہی اُس کا فون آیا کہ میں غلط جگہ پر اُتر گئی تھی مگر اتنی دیر میں ہماری گاڑی دوسری سڑک پر مُڑ چکی تھی سو دوبارہ اُس جگہ تک پہنچنے کے لیے 35 منٹ لگ گئے۔ ہمارے ہاں مڑنا تو ایک طرف ون وے توڑنے والوں کی بھی کمی نہیں وہ بہت مزے سے یہ کام کر کے ایسے سرخرو اور مطمئن نظر آتے ہیں گویا یہ قوم اسی احسان کی منتظر و محتاج تھی، بل کہ چوراہوں پر ٹریفک سگنل کو حقارت سے نظرانداز کرتے ہوئے گویا یہ کہہ رہے ہوں گے کہ ہمارے سامنے ٹریفک سگنل کی بھی کیا مجال کہ ہمارا راستہ روک سکے، ہم سا ہو تو سامنے آئے کی فخریہ تصویر بنے گزرتے ہیں۔ یہ جہالت زدہ فخر ہماری فلموں میں بھی نظر آتا ہے۔ مجھے ایک پنجابی فلم کا ایک سین یاد آ گیا جس میں ایک بدمعاش یا ولن ہیروئن کے بھائی سے پنجابی میں کہہ رہا ہے ـــ

"اوئے اپنی بہن کو سمجھا لے میرے خوابوں میں نہ آیا کرے ورنہ میں اُسے اُٹھا کر لے آؤں گا۔"

اُس کے بعد شاید "میرے چراغوں میں روشنی نہ رہی ـــ" کہ میں نے جدوں ہولی جئی لینا میرا ناں میں تھاں مر جانی آں ـــ یا سن ونجلی دی مٹھڑی تان وے میں تاں ہو ہو گئی قربان وے جیسے بولوں کی بھی پرواہ نہ کرنے والوں کی ـــ پرواہ نہ کر کے کان لپیٹے سینما ہال سے باہر کا رُخ کر لیا تھا۔

یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے میں کسی جگہ ایک ضروری کام سے موٹر سائیکل پر جا رہا تھا ایک مقام پر ٹریفک سگنل بند ہونے پر میں رُک گیا۔ میرے پیچھے ایک جوان لڑکا موٹر

اقبال خان یوسف زئی

سائیکل پر بیٹھ ہارن پر ہارن دینے لگا تو میں نے اپنے دائیں بائیں نظر ڈالی کسی طرف بھی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی کہ میں اُسے جانے کا راستہ دیتا دوبارہ اُس کے ہارن دینے پر میں نے بے حد تحمل سے پوچھ ہی لیا کہ بھائی یہ آپ کی موٹر سائیکل ہے۔ کہنے لگا ہاں جی۔ میں نے پھر پوچھا۔ آپ نے خریدی ہے جلدی سے غصہ سے کہنے لگا ہاں جی۔ میں نے کہا تو بھائی ایک سڑک بھی خرید لو اتنی دیر میں سگنل کھل گیا تھا اُس نے کیا کہا میں سُن نہ سکا۔ ظاہر ہے اُس بے چین نے گالی ہی دی ہو گی۔

اگلے دن ہم نے ایفل ٹاور دیکھنا تھا جس کے لیے شام کا وقت مقرر تھا ایسی جگہوں پر پارکنگ کا ملنا کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا اور یہ معجزہ ہوا ایفل ٹاور کے بالکل قریب ہماری گاڑی نے ایک پارکنگ گلی کا رخ کیا عین اُسی وقت ایک گاڑی پارکنگ سے نکل رہی تھی جیسے ہمارے آنے کی منتظر ہو۔ ایفل ٹاور کی حدود میں داخل ہونے کے لیے ٹکٹ لیے اوپر آنے جانے کے لیے لفٹ چلتی ہے نایاب اوپر جانے کے خوف میں مبتلا ہو گئی تو ہم نے بھی اوپر جانا وہ بھی بچوں کے ساتھ بہتر نہ سمجھا۔ اُس کی انتہائی بلندی اور انتہائی چوڑائی کی خوب صورتی میں کھو گئے چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی ایک فوٹو گرافر نے ہمیں مجبور کر دیا ہم ایک تصویر اُس کے کیمرے سے ضرور بنوائیں پوری فیملی تصویر بنوانے کے شوق میں اُس کے پیچھے، ایک لمبا چکر کاٹ کر اور فوٹو گرافر کی ہدایت کے مطابق ایک مقررہ مقام تک پہنچی اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں اُس نے ہماری تصویریں بنائیں وہاں سے ایفل ٹاور پوری لمبائی چوڑائی بلکہ پوری رعنائی کے ساتھ نظر آتا ہے ایک خوب صورت لمحہ ایک خوب صورت یاد کے ساتھ کاغذ پر مرتسم ہو گیا اور میری یادوں کے اوراق میں شامل ہو گیا۔ میوزیم کا پروگرام تھا مگر نہ جانے کیوں تساہل کی نذر ہو گیا۔ ورسلیز محل دیکھنے کا پروگرام بھی کسی اور آنے والے وقت پر چھوڑ دیا گیا کہ صورت حال پہلے جیسے ہی تھی آج بھی ٹکٹ دستیاب نہ تھے۔

ڈزنی لینڈ کا ذکر ہو اور اس ذکر میں والٹ ڈزنی کا نام نہ آئے وہ ذکر معتبر نہیں۔ والٹ ڈزنی نے بچوں کے لیے وہ کام کیا بلکہ اتنا بڑا کام کیا ہے جو اُس کے نام کو اُس کے کام سے بڑا بناتا ہے۔ خواب کو حقیقت بنانے والے والٹ ڈزنی نے 1955 میں لاس اینجلس امریکہ میں ڈزنی لینڈ بنایا تھا اور اب تک دنیا کے بارہ ملکوں میں ڈزنی لینڈ قائم ہو کر تفریح کی دنیا کا ایک عظیم کارنامہ ایک قابلِ فخر پہچان بن چکا ہے۔

کوئی مقام ہو تاریخی عمارت ہو پہاڑ ہو آبشار ہو دیکھنے سے پہلے اُس کا ایک نقش ذہن میں ضرور تشکیل پاتا ہے مگر میں جو سوچتا تھا ڈزنی لینڈ اُس سے کہیں زیادہ

خصوصیت کا حامل نکلا۔ میرے اندازے کے مطابق 50 ہزار گاڑیوں کی تو صرف اس کی پارکنگ ہی ہے اور پارکنگ سے ڈزنی لینڈ کی تفریحاتی حدود خود ایک بے حد وسیع رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔

بیٹا فیصل میری وہیل چیئر لے کر جب اندر داخل ہوا تو وہ تفریح گاہ اور سے کچھ ہی بنی چلی گئی میری تخیل پرواز سے ماورا۔ ملکوں ملکوں سے آئے ہوئے خوشیوں سے دمکتے ہوئے چہروں والی لوگوں کا ایک بے کراں ہجوم۔ میرے اردگرد بھی چہرے ہی چہرے خوشیاں اُن کے بدن سے خوشبوؤں کی طرح پھوٹتی ہوئی۔ عورتوں کے لباس مختصر باقی تمام بدن ہی بدن کہیں خوب صورت مرمریں بدن تو کہیں کالی گھٹا بدن۔ یوں تو میرا خیال ہے یورپ میں امریکہ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے جس کا ایک ثبوت تو ڈزنی لینڈ میں عورتوں کا زیادہ تعداد ہونا بھی نظر آتا ہے مگر شاید اس ہونے میں میرا امر دہونا بھی ہو۔

ایک منظر ہے کیا نوعمر کیا جوان عورتوں کے لباس ایک سے بڑھ کر ایک نئے فیشن میں ملبوس۔ شاید میں کچھ جلدی میں ملبوس کہہ گیا ورنہ اکثریت کے ''سینے اوچھے کے احسان کی طرح کھلے ہوئے'' زیادہ تر عورتوں کا جسم ڈھانپنے کے لیے کپڑے کفایت کا منہ بولتا ثبوت بلکہ ایک ہنر کی طرح دکھانے میں کوئی عار نہیں، کہیں بھی کبھی بھی دن ہے رات ہے کم سے کم لباس میں۔ کوئی خدشہ نہیں کوئی ڈر نہیں حریصانہ دیکھنے والی کوئی آنکھ نہیں گھورتی ہوئی کوئی نظر نہیں اور تو اور کیا امریکہ کیا یورپ سکول کی زیادہ تر لڑکیوں کا کم سے کم لباس میں ہونا فیشن بن گیا ہے۔ ایسی عورتیں بھی دیکھنے میں آئیں موٹاپے کا شکار شکم کے اوپر شکم چڑھا ہوا۔ پیچھا ایک اور پیچھے کے تعاقب میں طول سے زیادہ عرض میں مگر کم سے کم لباس کے معاملے میں وہ بھی کسی سے کم نہیں۔ میں نے پوچھا نہیں کپڑے کی صنعت کا یہاں کیا حال ہے!

چہار جانب نوجوان عورتوں کا مردوں کا بچوں کا بلکہ کیڈل میں بیٹھے ہوئے شیر خوار بچوں کا بھی ایک جگمگاتا ہوا ہجوم ہے کئی طرح کے جھولے اپنے مدار میں حرکت کرتے ہوئے آسمان کی بلندیوں کو چُھوتے ہوئے مناسب فاصلوں پر ایستادہ جس میں بیٹھنے والوں کو قطار میں کھڑے لوگوں کی باری ایک ایک گھنٹے کے بعد آتی ہے اور 5 یا 10 منٹ کے بعد دوبارہ زمین پر بس لوگوں کا ایک نہ رُکنے والا گویا ایک سیلاب ہے جو نہ رُکتا ہے نہ قطار میں کھڑے تھکتا ہے پھر کارنیوال نکلتا ہے ایک دفعہ نہیں بلکہ تین مرتبہ کارنیوال بچوں کے پسندیدہ کومک کرداروں پر مشتمل آدمیوں کے سوانگ بہروپ پیدل بھی مخصوص گاڑیوں پر بھی رنگ و نور کا ایک طوفان

رواں دواں ہو جیسے موسیقی کی دُھنوں پر ناچتے گاتے یہ کارنیوال مخصوص کردہ سڑک سے گزرتے ہیں آدمیوں کے پرے کے پرے اُن کے کمالات حرکات اُن کے رقص کو اُن کے ہنستے ہوئے چہروں کو کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کارنیوال میں شریک لوگوں کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہیں اپنے اردگرد کھڑی خواتین اور اُن کی گود میں بیٹھے بچے بھی خوشی اور تعجب سے معصومیت سے اپنی گردنیں اونچی کر کے یہ سب کچھ دیکھتے ہیں۔ کومک کردار اپنی عجیب وغریب حرکات سے موسیقی کے آلات سے خوشیوں کے سُروں کے ساتھ کمال طمانیت کا احساس دلاتے ہوئے کانوں کے رستے دلوں میں اُتر جاتے ہیں کہ آدمی کا دل چاہتا ہے وہ بھی خوشیوں خوشبوؤں کی دھنک رنگوں کی کہکشاں میں کہیں کھو جائے گم ہو جائے یا ایڑیوں کے بل کھڑا ہو کر رقص کرنے لگے۔ آدمی اُس وقت چونکتا ہے جب جسم کے اندر قلقاریاں مارتا ہوا جذبہ پُرسکون ہو جاتا ہے۔ جب کارنیوال میں حصہ لینے والا آخری فرد آخری گاڑی منظر سے پس منظر میں نہیں چلی جاتی۔ لطف کی اگر کوئی حد ہوتی تو ضرور بتاتا۔

پیرس سے اگلی صبح ناشتے کے فوراً بعد ہم سوئٹزرلینڈ کے لیے روانہ ہوئے یہ ایک لمبا سفر تھا ہم دو جگہ تھوڑی دیر رکنے کے بعد تقریباً شام کے وقت جنیوا پہنچے ہوٹل میں کمروں کا انتظام پہلے ہی کرا لیا گیا تھا ہماری دوسری گاڑی راستے میں ایک غلط موڑ پر مڑنے کے بعد اڑھائی گھنٹہ دیر سے پہنچی۔ اگلی صبح ہم نے گاڑی کو تھپتھپایا جیسے گھوڑے کو تھپتھپاتے ہیں اور انٹرلاکن جانے کے لیے کمر ہمت باندھ لی۔

20 برس پہلے کا سوئٹزرلینڈ یادوں کی دھندلی دھندلی فضا میں تھوڑا جانا تھوڑا ان جانا لگ رہا تھا۔ ہوٹل کے جس کمرے میں قیام تھا اُس کے پیچھے ایک اپارٹمنٹ ہے۔ جہاں میرا بیٹا فرخ سی ایس ایس کرنے کے بعد پہلی پوسٹنگ جنیوا ہونے پر ٹھہرا تھا اور ہم دونوں میاں بیوی اُس سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے وہ تمام یادیں ایک ایک کر کے آئینہ خانہ دل میں اُتر آئیں۔ میرا ہر صبح سیر کے لیے گھر سے نکلنا ریلوے سٹیشن عبور کرتے ہوئے جھیل (لیک) پر آنا پھر اُسی راستے سے گھر لوٹنا۔ اپنی رفیق حیات کے نہ ہونے پر دل کو ایک عجیب سی بے کلی ہوئی۔ یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل۔ وہی اپارٹمنٹ قریب ہے وہی جھیل، وہی میں ہوں مگر وہ نہیں ہے یہاں بھی نہیں ہاں بھی نہیں جہاں سے چل کر میں یہاں آیا ہوں وہ کہیں نہیں دنیا کے کسی کونے خطے میں نہیں، انسان زندہ ہو تو وہ کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے نہ ہو تو وہ کہیں نہیں ملتا میں گم صم بستر پر لیٹ گیا دوسرے کمرے

میں میرا بیٹا۔ اور اُسی کی بیوی بچوں کی آوازوں کو سُن رہا ہوں - آوازیں جو میرے دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں ہولے ہولے تیز تیز ___ صبح انٹر لاکن (Interlanken) کے لیے نکلنا ہے۔ سوئٹزر لینڈ کا ایک خوبصورت مقام سوئٹزر لینڈ اپنی پوری رعنائی کے ساتھ پوری خوب صورتی کے ساتھ اپنے دلکش دلفریب مناظر کے ساتھ فضا میں ہلکی ہلکی بارش کی جلترنگ کے ساتھ چل رہا ہے میں بیٹھا ہوا دل میں ذہن میں خیالوں میں یادوں میں گنگنا رہا ہوں۔ اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔ دونوں گاڑیاں جھیل کنارے ایک مقام پر کھڑی ہیں بارش قدرے زیادہ ہو گئی ہے گاڑیوں سے ہمارے تین چار مَن چلے بارش میں بھیگنے کے لیے اُترتے ہیں میں اِس منظر سے دِل ہی دِل میں لطف اُٹھا رہا ہوں۔ گاڑیاں ایک دفعہ پھر روانہ ہوتی ہیں میں رحمان کی گاڑی میں ہوں بیٹے کی گاڑی جو ہم سے پہلے روانہ ہوئی تھی اُس نے فون پر بتایا کہ وہ ایک غلط موڑ مڑتے ہوئے پندرہ یا بیس منٹ کے بعد ہم تک آئے گا۔ رحمان اپنی گاڑی کی لوکیشن بھیجتا ہے کہ میں اس مقام پر تمھارا انتظار کر لیتا ہوں۔ معاً ایک پولیس گاڑی آ جاتی ہے رحمان کو اُترنے کے لیے ایک خاتون پولیس آفیسر نے کہا دو چار جملوں کا تبادلہ ہوا پھر اُنھوں نے اپنے پیچھے آنے کو کہا پولیس گاڑی پر بھی واضح طور پر لکھا ہوا آ رہا ہے ہمارے پیچھے آؤ یا خدایا کیا ماجرا ہے پولیس گاڑی وہاں ایک ہوٹل کی راہداری میں ٹھہر جاتی ہے ہمارے پاسپورٹ چیک کیے جا رہے ہیں پولیس گاڑی میں سکینر لگا ہوا ہے جہاں یہ عمل مکمل کیا گیا ہے میرا پاسپورٹ فیصل کی گاڑی میں تھا اُسے بھی بلایا جاتا ہے۔ رحمان کہتا ہے میں کھڑا تھا گاڑی وہاں پارک کی جا سکتی ہے پولیس والی خاتون کہتی ہے کہ آپ خود کہتے ہیں کہ دوسری گاڑی کا انتظار تھا مگر یہ تو ایمرجنسی نہیں ہے بیٹے کی گاڑی بھی آ جاتی ہے اُس کے کاغذات اور پاسپورٹ وغیرہ چیک کیے جاتے ہیں اور پھر ہمیں بغیر کسی چالان / ٹکٹ کے جانے کی اجازت مل جاتی ہے میں اُن کی خوش اخلاقی اور فرائض کی ادائیگی پر دل ہی دل میں داد دیتا ہوں۔ پولیس کو ہر ملک میں خاص اختیارات حاصل ہوتے ہیں مگر ہمارے ہاں اکھڑ پن بھی شامل ہے شاید اختیارات کا زیادہ ملنا ہمیں نہیں بھاتا کیا یورپ کیا امریکہ پولیس کے رویے میں خاص طور پر محسوس کیا کہ وہ خوش اخلاقی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے لیکن فرائض کی ادائیگی میں غفلت نہیں کرتے نکسن کے عہدِ صدارت میں اُن کی بیٹی سارہ نکسن کا ایک ٹریفک قانون کی خلاف ورزی پر چالان کیا گیا تھا جرمانے کی ادائیگی کر دی گئی مگر ملک کے صدر نے اپنے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا ہمارے ہاں چالان

کرنے والے کا کیا حال ہوتا......!!
انٹرلاکن آ گیا ہے مسلسل ہلکی ہلکی بارش جاری ہے جس سے ٹھنڈک بڑھ گئی ہے اور میرا جسم گرم کپڑے کی طلب کر رہا ہے مگر سوئٹر تو ہوٹل میں رکھے ہوئے سوٹ کیس میں تھے میں اپنی کوتاہی پر اپنے آپ کو ملامت کرتا ہوں۔ بیٹا وہیں کے کسی سٹور سے خریدی ہوئی ایک جیکٹ میری طرف بڑھاتا ہے ابّو آپ یہ پہن کر دیکھیں، میں پہنتا ہوں میرے ناپ کی تھی میری آنکھیں تشکر سے اُسے دیکھ رہی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کر رہی ہیں کہ بیٹے نے صورت حال کو سمجھنے میں کس قدر عجلت کی ہے دل سے جیتے رہو فیصل نکلا اور وہیں فضا میں کہیں گھل مِل گیا۔ انٹرلاکن کے لیے میرے ذہن میں پہلا جُملہ تو یہی آیا کتنی خوبصورتیوں میں گھرا ہوا ہے میرے بائیں جانب جو جھیل ہے جنیوا سے میرے ساتھ چل رہی ہے کبھی دُور اور کبھی چھپی ہوئی کبھی سڑک کے بالکل قریب لیکن یہاں انٹرلاکن میں تو جھیل کے قریب پہاڑ ہے جھیل کی فصیل کی طرح ہمارے بائیں جانب بھی پہاڑ ہے جہاں ہم تھوڑی دیر پہلے چیئر لفٹ سے اوپر گئے ہیں بالکل ایک چھوٹے سے کمرے کی مانند مگر محفوظ۔ زمین سے چیئر لفٹ پہاڑ کی بلندی تک جاتی ہے تو لفٹ کا دروازہ خود بخود بند ہو جاتا ہے آپ کھڑے ہوئے چاروں طرف اردگرد کے تمام مناظر دیکھتے ہوئے جا رہے ہیں بادلوں کے بالکل قریب بلندی درختوں کی بہتات دور حدِ نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ لفٹ ایک خاص حد تک جا کر رُکتی ہے جہاں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے میزیں کرسیاں سلیقے سے سجی ہوئیں ویٹر۔ ویٹرس آپ کا آرڈر ہمہ تن گوش سُنتے ہیں اور تکمیل میں لگ جاتے ہیں اوپر سے دکھائی دینے والے مناظر کو شائقین اپنے موبائل کیمرے میں محفوظ کر رہے ہیں یادوں کے طاق پر سجانے کے لیے آنے والے کسی وقت میں دیکھنے اور دکھانے کے لیے رم جھم جاری ہے جنیوا واپسی کے سفر کی طرح میرا ذہن ہنزہ، نگر، ناران، کاغان، کیلاش کی وادیوں برف سے ڈھکے بابو سر ٹاپ کی طرف چلا جاتا ہے۔ کوہ ہندوکش کے ٹو ماونٹ ایورسٹ جہاں تینوں پہاڑ مل رہے ہیں جہاں لالہ زار ہے کالام ہے وہاں کیا نہیں ہے گلیشئرز ہیں آبشاریں ہیں۔ جھیل سیف الملوک ہے جہاں سُنا تھا پریاں نہانے کے لیے آتی ہیں۔ آتی ہوں گی مگر جیپ مافیا وہاں سڑک بننے نہیں دیتا کہ کہیں زیادہ پریاں نہ آ جائیں کوئی ایسا ٹل نہیں کوئی قابلِ ذکر محفوظ سڑک نہیں ہمارے ہمسایہ ملک کو الہ دین کا چراغ مل گیا ہے پہاڑوں کے اوپر طویل حیران کُن ناممکن سڑک بنا دی ہے کاش وہ چراغ ہمارے پاس بھی ہوتا۔ ہم کم از کم وہاں سوئٹزرلینڈ ہی بنا لیتے۔

اب ہمارا واپسی کا سفر برمنگھم کے لیے یہ ایک لمبا سفر ہے ہم نے پیرس کی سرحد کیلس (Calais) سے فیری میں بیٹھ کر برطانیہ کی سرحد ڈوور (Dover) سے برمنگھم کی طرف تیز تیز سفر فیری کی روانگی کے وقت پہنچنے کے لیے کیا لیٹ ہونے کی صورت میں بات اگلے دن پر جا سکتی ہے میری روانگی سے قبل کیلس وقت پر پہنچ جاتے ہیں تو دم میں دم آتا ہے واپسی سٹمپ لگوائی فیری کی روانگی عمل میں آتی ہے سمندر کے سینے پر تیرتی ہوئی فیری نے وہی نوے منٹ کا وقت لیا فیری ڈیک سے گاڑیوں میں بیٹھے قریبی فیول سٹیشن سے پٹرول لیا اس کام کے لیے وہاں کوئی آدمی نہیں ہوتا آپ نے خود یہ کام کرنا ہے ادائیگی بنک کارڈ سے کرنی ہے رات کو کہیں 2 بجے برمنگھم پہنچے ہوٹل میں کمرے بک کرائے اور صبح کے انتظار میں سوتے رہے اگلے دن ریڈنگ جانا ہے سلمان کی طرف سے دی گئی بار بی کیو دعوت میں شریک ہونے کے لیے بہر حال اگلی صبح 30 جولائی کو سلمان کے گھر پہنچے بار بی کیو کا انتظام بہت شاندار تھا لان کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ دعوت کے اختتام پر بیٹا تو برمنگھم اپنی فیملی کے ساتھ چلا گیا میں رحمان کی فیملی کے ساتھ سلمان کے گھر سب ایک رات کے لیے ٹھہر گئے کہ انھوں نے لاہور واپس جانا تھا اور میں نے نیوجرسی امریکہ اپنے بیٹوں کے پاس اگلی صبح 31 جولائی کو ہم رحمان کی گاڑی میں ایئر پورٹ روانہ ہوئے راستے میں کسی جگہ شاید کوئی حادثہ ہو گیا تھا ٹریفک سست روی سے رواں تھی اور میری بے چینی تیز رفتاری کا تقاضا کر رہی تھی لاہور جانے والوں کی فلائٹ تو یوں بھی میرے بعد تھی بھاگم بھاگ ایئر پورٹ پہنچے رحمان کے بڑے بھائی وہاب نے جس طرح دوڑ لگائی شکر ہے بورڈنگ ہو گئی گاٹ وک ایئر پورٹ سے ورجن اٹلانٹک ایئر لائنز کے طیارے میں بیٹھنے کے لیے پرواز کا وقت دوپہر ایک بجے کا تھا نیو یارک کے جے ایف کینیڈی ایئر پورٹ پر یکم اگست کو صبح 4 بجے طیارہ نے لینڈ کرنا تھا۔ ہوائی جہاز میں بیٹھے بیٹھے 6 گھنٹے گزر گئے لوگوں کا اطمینان دیکھ کر میں بھی حیران ہو گیا کہ کیسے صابر لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوں جیسے اُن کے لیے گھنٹوں بیٹھنا کوئی بات نہ ہو ایئر ہوسٹس سے بھی میں نے پوچھا۔ یہ جہاز چلے گا بھی یا نہیں اُس نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔ معلوم نہیں کہ کب چلے! دل میں سوچا عجب لال بجھکو خاتون ہے مجال ہے کہ یہ بھی پوچھ لیا ہوتا آپ نے کچھ کھانا بھی ہے یا نہیں۔ خیر 6 گھنٹے بعد جہاز کے پائلٹ نے جانے کیا سوچ کر چلنے کی خوشخبری سُنائی معلوم ہوا کہ نیو یارک میں طوفانی بارش کے سبب پرواز میں تاخیر ہوئی۔ یعنی ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا'' اب جہاز میں سوار مسافر اپنے بنک کارڈ پر کھانے پینے کا سامان خرید رہے ہیں تو عقل آئی کہ یہ تو کوئی خاص ہی جہاز ہے۔

ہم ہنس دیئے ہم چپ رہے
منظور تھا پردہ تیرا

اب کسی کے پاس کارڈ ہی نہ ہو تو وہ کیا کرے دل نے کہا یہ موسی ایئرلائن نہیں۔ یہ تو مری ایئرلائن ہے جہاز کے پائلٹ نے 6 گھنٹے تاخیر اور پرواز کے 7 گھنٹے بعد جب جے ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر جہاز رنجہ فرمایا تو مجھے قدم رنجہ کے معنی اچھی طرح سمجھ میں آ چکے تھے ایئرپورٹ پر بڑا بیٹا محرم میرا منتظر تھا اور میں اُسے گلے لگانے کے لیے مضطرب۔ انتظار اور اضطراب باہم ہوئے تو دل کیا بانہوں تک کو سکون مل گیا۔ اب یہاں فرخ کے گھر قیام کے دوران معلوم ہوا کہ یہ فیملی 16 اگست کو ویانا (آسٹریا) 20 دن سیر کا پروگرام مہینوں پہلے بنا چکی ہے میرے پاس تو وہاں کا ویزا نہ تھا کہ سیر و سفر میں اُن کے ہمراہ ہوتا سو میں نے اُن کی واپسی تک کیلئے فوریاً اپنے تیسرے بیٹے حسن کے گھر اپنے آنے کی اطلاع دی سان فرانسسکو ایئرپورٹ پر میرا پوتا اسد مجھے لینے کے لیے موجود تھا یہ ہوائی سفر ساڑھے چھ گھنٹے کا ہے مگر یہ اندرون امریکہ سفر ہے اس لیے میں نیوجرسی سے کھانا اپنے ساتھ لایا تھا یہاں بھی موسم خوشگوار تھا اطلانٹک (بحراوقیانوس) سے پیسفک (بحرالکاہل) کا یہ سفر نیو یارک سے سان فرانسسکو گویا دنیا کے دو بڑے سمندر امریکہ میں ہیں سان فرانسسکو گولڈن گیٹ لمبارڈ سٹریٹ اور سمندر کے اوپر (بے پر) میلوں لمبی چار چار لین کی آنے اور جانے کے لیے انجینئرنگ کے پورے کمال اور جمال کے ساتھ سڑک کے اوپر سفر کرنا بذات خود اتنا پُرکشش ہے کہ میں پہلے بھی اور آج بھی اُس تجربے سے گزرنے میں ایک طلسماتی آگہی پاتا ہوں کیا منظر ہے آپ اُس سڑک سے گزر رہے ہیں آپ کے دائیں طرف اور بائیں طرف اور سامنے سمندر بہہ رہا ہے بحرالکاہل دنیا کا سب سے بڑا سمندر 63 ملین مربع میل میں پھیلا ہوا یہاں سڑک سے پانی کو دیکھیے جیسے نیچے کوئی اَن دیکھی اُنگلیوں سے پانی کو گدگدی کر رہا ہو ہلکی ہلکی سی لہریں خود اپنے بوجھ سے گرتی اُٹھتی مچلتی ہوئی خراماں خراماں چلتی ہوئی۔

31 اگست کو میں دوبارہ کیپی ٹولا (Capitola) ساحل پہنچا بحرالکاہل کو دیکھنے اُس سے ملنے میری طرح ہزاروں اُس کی لہروں کو دیکھنے آئے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کنار ساحل بیٹھے لوگوں کے پاؤں کو چومتی ہوئی بے قرار لہریں اک شور کے ساتھ ہلکی سی بلندی پر پہنچ کر جیسے کوئی نیچے سے سر اُٹھا کر آواز دے یا دستک دے کر پانی کا حصہ بن جائے سمندر بن جائے۔

ایک دن ہفتے کو سان فرانسسکو "ایکیوریم آف دی بے" دیکھنے گئے دو منزلہ مناسب سی بلندی کی عمارت مگر لفٹ سے مزین۔ رنگین سنہری روپہلی ان گنت رنگوں سے منقش شارک وہیل چھوٹی بھی بڑی بھی مچھلیوں کے لیے قدرتی ماحول کو بنانے سجانے اور سنوارنے میں جو ندرت اور جو جدت نظر آئی دل سے واہ واہ نکلتی ہے۔

5 ستمبر کو یونائیٹڈ ایئر لائن کی پرواز سے نیو آرک ایئر پورٹ اور پھر دوبارہ جہاں سے چلا تھا نیوجرسی میرے بے حد مصروف بیٹوں نے مجھے ہر ممکن طور پر مصروف رکھا بلکہ نیاگرہ آبشار کا پروگرام بھی بنایا تھا ماموں زاد بہن کے بیٹے کو کینیڈا سے ملنے آنا تھا مگر عین وقت وہ کسی ضروری کام کی وجہ سے نہ آ سکا۔ اگلے دن 10 ستمبر میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ بوسٹن میں مقیم اپنی ماموں زاد بہن کی بیٹیوں سے ملنے گیا اتفاق سے وہاں دو اور ماموں زاد بہن کی بیٹیوں سے ملاقات ہوگئی ایک فلوریڈا سے آئی تھی اور دوسری لاہور سے اُن کی گرم جوشی اور محبت کا کیا ذکر کروں وہ محبت کی ملاقات ایک ایسی ملاقات تھی جس کے بارے میں کسی نے کہا تھا ''محبت آپ سے کچھ نہیں مانگتی ـ سوائے محبت کے۔''

بہت عرصہ پہلے جب مجھے پہلی دفعہ نیو یارک دیکھنے کا موقع ملا تھا میں اُن دنوں کتنے تعجب سے دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ اس قدر بلند و بالا عمارات نیو یارک کا حُسن ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت مجھے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی 103 منزلہ عمارت کو دیکھ کر ہوئی تھی اور اُس سے بھی زیادہ حیرت اِس بات پر ہوئی 1930 میں اس بلڈنگ کو بنایا گیا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی اِسے بنا کر فارغ ہوا ہے بلکہ اس لمحہ موجود میں کسی نے اِس پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے اِس قدر صاف و شفاف کیا دیواریں کیا در کیا کھڑکیاں کیا فرش کہ خود صفائی بھی جھوم جھوم اُٹھے 95 سال پہلے کی بنی ہوئی اِس عمارت کا حُسن پہلے دن کی طرح نظر آتا ہے اُس کی دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی فرش پر پاؤں رکھتے ہوئے گمان ہوتا تھا کہ کہیں فرش میلا نہ ہو جائے اور پھر ـــ

آج 2025 میں امریکہ سے واپسی کے سفر میں میرے پاس صرف 3 دن بچے ہیں 13 ستمبر کو نیو جرسی سے 101 منزلہ ایج ٹاور (Edge Towar) دیکھنے گیا جو حال ہی میں تعمیر ہوا ہے ایک صد منزل پر پورا نیو یارک نظر آتا ہے دریائے ہڈسن جہاں پانی کی لمبی اور چوڑی ایک لکیر کی طرح نظر آتا ہے بلند و بالا فلک بوس عمارات اپنے پورے قد و قامت پورے حجم کے ساتھ۔ دوڑتی ہوئی کاریں، ٹرک کھلونا کاریں اور ٹرک، چلتے پھرتے مرد و زن بونوں کی طرح صرف متحرک ہیں اور پھر ذہن کو چونکا دینے والا ایک کونہ نکلا ہوا آر پار شیشے کا بنا ہوا مضبوط نہیں زبردست مضبوط گلاس فلور، میرے ذہن میں اُسے دیکھ کر بس ایک لفظ آتا ہے ''کوتہ حیرت'' ـــ بلکہ لفظ بھی جہاں بیگانہ سا بے مایہ سا ہو کر اپنے معنی کھو دیتا ہے۔ خیال آفریں منظر کا حامل مقام حیرت و تعجب کا شاہکار وہ خاص کونہ ہڈسن یارڈ 1100 فٹ نیچے تک کا منظر ایک سنسنی سی جسم میں دوڑنے لگتی ہے رگ و پے میں حیرت سرایت کرنے لگتی ہے مسرور کن لمحات کی مستی دِل کی گہرائیوں سے تعجب اور آفرین کے کلمات ادا کرتی ہے 100 ویں منزل سے

تمام اطراف میں دیکھتے ہوئے سوچتا ہوں اس زمین پر بسنے والے کو قدرت نے کتنی خوبیوں سے نوازا ہے۔
نوعمر افراد جوان توانا مرد بھی عورتیں بھی وہیل چیئر کے افراد بھی اُس کوئیہ حیرت پر بیٹھے ہوئے لیٹے ہوئے کھڑے ہوئے خوشی اُن کے انگ انگ سے پھوٹتی ہوئی اطمینان اور سکون کے ساتھ موبائل فون کے کیمروں سے تصویریں اُتار رہے ہیں اپنے دوستوں عزیزوں کو دکھانے کے لیے یادوں میں اِن لمحات کو سجانے کے لیے 14 ستمبر کا دِن بھی ایک طرح سے میرے لیے بے حد مصروفیت کا گزرا دونوں بیٹوں خرم اور فرخ نے اطلانٹیک سٹی جانے کا پروگرام بنایا بحرِ اوقیانوس (Atlarrtic) کے ایک ساحل پر کیسینوز کی عمارات ہیں جہاں چوبیس گھنٹے صرف جوا کھیلا جاتا ہے چھوٹے پیمانے پر بھی اور بڑے پیمانے پر بھی ہزاروں مشینوں بلکہ جوا مشینوں پر لوگ اپنی قسمت آزماتے ہیں شراب کی اور کھانے پینے کی دکانیں اپنے کاروبار کے نشے میں مست رہتی ہیں مختصر سے مختصر لباس کی عورتوں کو بھی اگر مستی میں شمار کرلیا جائے۔
میرا خیال ہے کہ انسان فطری طور پر آسان ذرائع سے کمائے پیسے پا کر جتنا خوش اور مسرور ہوتا ہے وہ اپنی جگہ مضبوط حقیقت ہے مجھے کیسینوز جیسی جگہوں پر جا کر ایک عجیب سا احساس ہوا میں سوچنے لگا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ زیادہ تر ہارے گا اور کیسینو جیتے گا مگر پھر بھی کھیلتا ہے۔ ہارتا ہے اور اگر جیتے بھی تو وہاں جیتی ہوئی رقم سے مزید پیسے کمانے کا خیال جڑ پکڑ لیتا ہے جب تک وہ تمام رقم جو ساتھ لے کر آیا تھا یا وہ جیتا تھا دوبارہ داؤ لگا کر ہار نہیں جاتا اور کیسینو چھوڑ نے پر مجبور نہیں جاتا۔ تاہم جو کام عمر بھر نہیں کیا تھا وہ بھی مشغلے کے طور پر کیا۔ ایک ڈالر کے گیارہ ڈالر بھی ہوئے مگر کیسینو نے جیت ہی جانا تھا جو میرا ایک ڈالر بھی لے گیا کچھ وقت بحرِ اوقیانوس کے کنارے پڑی ہوئی ریت پر ننگے پاؤں چل کر بحرِ اوقیانوس کے پانی سے اپنے گھٹنوں کو بھگوتا رہا پانی کا شور لہر لہر سنتا رہا اور دِل ہی دِل میں مسکراتا رہا۔ مسکراتا ہوا یہ دِن بھی تمام ہوا اور پھر ہم اپنی دنیا میں واپس چلے آئے کاروبارِ زندگی کو نبھانے کے لیے چلانے کے لیے۔
ہر سورج دِن کے اختتام پر ڈوب جاتا ہے اگلی صبح میں نکلنے کے لیے اندھیرا دور کرنے کے لیے ایک نئی اُمنگ ایک نیا جذبہ پیدا کرنے کے لیے محبت کی روشنی پھیلانے کے لیے روشنی جو زندگی ہے آج 16 ستمبر ہے میں اپنی سرزمین پر اپنی پہچان پاکستان جا رہا ہوں ایر لائن امارات کا طیارہ مجھے پہلے دوبئی لے جائے گا اور پھر لاہور میرا اپنا لاہور اور......

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

☆☆☆☆☆

''مسیحا! تم تو واقف ہو''...... [طنز و مزاح]

یقین مانیے اس قضیے میں فقط ہم ہی مغالطے کا شکار نہیں ہیں بل کہ اپنے جیسے ہزاروں ہم وطن بھائی بہنیں بھی مسلسل اسی خلفشار اور ذہنی پریشانی سے دوچار رہے ہیں۔ ہزار ہا کوششوں کے باوجود بھی اس معاملے اور مغالطے کا کوئی مناسب حل نظر ہی نہیں آ رہا آقائے من استاد یاری خان بے تاب تو سرے سے اسے مغالطہ ماننے کو بھی تیار نہیں بل کہ وہ تو اسے کھلم کھلا گمراہی اور نری بے وقوفی ہی شمار کرتے ہیں۔

''ڈاکٹر'' کا نام سن کر جو اولین دلکشا پیکر ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے اور جو حسین شبیہ ہمارے دماغ میں بنتی ہے اسے لباس مجاز میں دیکھ کر حقیقت بالکل اس شیشے کی طرح چکنا چور ہو جاتی ہے جسے کسی شریر بچے نے غلیل سے نشانہ بنا کر کرچی کرچی کر دیا ہو ''ڈاکٹر'' کی اصطلاح ہم بنیادی طور پر اس مسیحا اور معالج قوم کے لیے استعمال کرتے ہیں جو سفید اوور کوٹ پہنے، گلے میں سٹیتھو سکوپ لٹکائے بیماریوں کا علاج کرتے اور ہمارے دردوں پہ پھاہا رکھتے ہیں مگر یقین مانیے ہم نے خود اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بعض صورتوں میں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہی نکلتا دکھائی دیتا ہے اور جس مسیحا کو ہم انسانی امراض کا ڈاکٹر سمجھ کر ان سے باقاعدہ علاج کروانے پہنچ جاتے ہیں وہاں سے مسیحائی کرنے کوئی اور ہی نکل آتا ہے (فرہاد کے تابوت سے رانجھا برآمد ہوتا ہے) گویا کہ بقول شاعر:

دنیا کا ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

....

آپ کو یہ جان کر خوش گوار حیرت ہو گی (ممکن ہے نہ بھی ہو؛ ایسا ہونا ضروری بالکل بھی نہیں ہے) کہ ہمارے ہاں محض انسانوں کا علاج کرانے والے ہی ''ڈاکٹر'' نہیں کہلائے جاتے بل کہ اور بھی بہت سے جواہر دانا اور گوہر یکتا ایسے موجود ہیں جو ''ڈاکٹر'' کے نام اور کام دونوں پہ زبردستی قابض ہو کر دنیا و مافیہا کا لطف، احترام اور نیکیاں لوٹ رہے ہیں درحقیقت ہم کئی لحاظ سے ایک

نور کمال شاہ

خوش قسمت قوم واقع ہوئے ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ذرا ایک نظر ہماری خوش نصیبی تو ملاحظہ فرمایئے گا کہ ہمارے ہاں جس طرح ''استاذ'' نامی دانا و بینا شخصیات بیسیوں طرح کی ہوسکتی ہیں بعینہ ڈاکٹر بھی ہمیں کئی قسم کے دستیاب ہیں اور آسانی سے مل بھی جاتے ہیں استاد ہی کو لے لیجئے گا! اچھا بتائیں استاد کون ہے؟ چلیں جواب ہم سے ہی سن لیجئے کہ سکول وکالج میں پڑھانے والا اگر ''استاذ'' ہے: مدرسے اور دارالعلوم میں درس دینے والا ''استاذ'' ہے تو ڈاٹسن، کار اور ویگن چلانے والا بھی تو ''استاذ'' ہی کہلاتا ہے ٹرک اور بس چلانے والے بھی اسی زمرے میں شامل ہیں گاڑیوں کے ورکشاپ میں کام کرنے والا کاریگر بھی ''استاذ'' ہی کہلایا جاتا ہے تجربہ کار مستری ''استاذ'' ہے تو ساتھ ہی ہنرمندی سے تالے کھولنے اور چوری کرنے والے بھی ''استاذ'' ہی کے درجے پر متمکن ہیں اور انھیں بھی اس فہرست سے کسی طور نکالا نہیں جاسکتا---!!!

ذوق بھی تو شاعری کے ''استاذ'' ہی ہیں اور یاد ہے، مرزا غالب بھی تو میر کی استادی کے سامنے اپنی خاکساری کا اظہار یوں کر بیٹھے تھے:

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

....

ہماری اتنی مجال ہی کہاں جوان میں سے کسی کی استادی سے انکار کرسکیں۔ چنانچہ ایسی پیچیدہ صورتحال میں اتنا جاننا ہمارا اولین فرض بنتا ہے کہ ہر ''استاذ'' کو پڑھانے والا ''استادمحترم'' سمجھ کر اس کے پاس اپنا بچہ پڑھنے کے لیے بھیجنا حد درجے کی بے وقوفی اور اول درجے کی نادانی ہی ہوگی۔

آیئے اب آتے ہیں ڈاکٹروں کی جانب نوع نوع کے ڈاکٹر ہمارے ہاں نہ صرف موجود ہیں بل کہ خدمت کو ہاتھ باندھے تیار بھی رہتے ہیں:

ہر گھڑی تیار تابعدار ہیں ہم----!!!

یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کے بھی باقاعدہ ڈاکٹر ہوتے ہیں جو حیوانات کا علاج کرتے ہیں اور بس اسی کام میں ماہر ہوتے ہیں ان ڈاکٹروں کو ''ویٹرنری ڈاکٹر'' کہا جاتا ہے ظاہر ہے انسانی ڈاکٹروں سے حیوانات کا اور حیوانات کے ڈاکٹروں سے انسانوں کا علاج کرانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی قصائی کو جوتے گانٹھنے یا درزی کو بال کاٹنے کے کام پر

لگا دیا جائے ایسی صورت میں نتیجہ کیا برآمد ہوگا آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے اور یہی کچھ ہوا ایک دفعہ ان جانے میں ایسے ہی حیوانات کے کسی ''ڈاکٹر'' کے پاس ایک بندہ اپنے پیٹ کے درد کا علاج کرانے پہنچا درد کے مارے پیٹ پر ہاتھ رکھے اس بندے کو جب بتایا گیا کہ ''محترم! آپ غلط جگہ پر آگئے ہیں؛ یہ حیوانات کے ڈاکٹر صاحب ہیں اور فقط ان ہی کا علاج کر سکتے ہیں؛ آپ اپنے لئے کوئی انسانوں والا ڈاکٹر ڈھونڈ لیجئے گا''، تو انہیں یہ سن کر حیرت کا ایسا شدید جھٹکا لگا کہ چند ثانیوں کے لیے اپنا درد ہی بھول بیٹھے مگر پھر سنبھل کر بولے کہ ''چلیں جی! کوئی بھی ہوں؛ ''ڈاکٹر'' تو بہر حال ہیں نا اور اس حساب سے پورا نہ ہی کم از کم تھوڑا سا علاج تو انسانوں کا بھی ضرور کر سکتے ہوں گے'' مجھے سو فی صد یقین ہے کہ اس بندے کو جانوروں کو زبردستی لگائی جانے والی بڑی سوئی اور میگا سرنج کے ذریعے دھمکا کر ہی وہاں سے بھگا دیا گیا ہوگا یہ ڈاکٹر صاحب تو خیر کوئی بھلے مانس انسان تھے جنھوں نے فقط مریض کو بھگانے پر ہی اکتفا کر لیا ورنہ ایسے نادر مواقع پر اکثر ڈاکٹر صاحبان داڑھ دکھلانے کے بہانے معشوق کا منہ کھلوا کر زبان کی لمبائی ہی ناپتے ہیں۔

انسانوں اور حیوانات کے ڈاکٹروں کے علاوہ ہمارے ہاں ''سبقی ڈاکٹرز'' بھی عام ہیں یعنی کسی خاص مضمون کا بھی ایک ڈاکٹر ہوتا ہے یہ ذرا الگ قسم کے ڈاکٹر ہوتے ہیں جن کا ''دوا'' یا ''شفا'' سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا یہ اپنے مضمون میں پی ایچ ڈی ہو کر ڈاکٹر آف فلاسفی کہلاتے ہیں (چاہے مضمون ان کے قابو میں آیا ہو یا نہ آیا ہو) ایم بی بی ایس ڈاکٹر بننے کی طرح کسی زمانے یہ بھی بڑی جان جوکھوں کا کام تھا اور مشکل ہی سے پی ایچ ڈی ڈگری پایہ تکمیل تک پہنچ پاتی تھی پوری یونیورسٹی سے سالانہ بمشکل آٹھ دس ''ڈاکٹر'' ہی نکلتے تھے جو اپنے فن میں علامہ اور ہنر میں یکتا ہوتے تھے مگر پھر ملک کے دیگر شعبوں کی طرح تعلیم کے شعبے میں بھی ہماری بے انتہا ترقی نے اس کام کو کافی سہل بنا دیا۔۔۔

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں۔۔۔۔

اور اب خیر سے آج کل ہمارے ہاں پی ایچ ڈی ڈگریاں ریوڑیوں کے بھاؤ ملتی ہیں سالانہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کے حساب سے پی ایچ ڈی ڈاکٹرز یونیورسٹیوں سے نکل کر بے روزگاروں

کی شرح میں خاطر خواہ اضافہ کر رہے ہیں ہماری علمی فراخ دلی اور سخاوت کا عالم ملاحظہ ہو کہ پی ایچ ڈی کے لیے لازمی تحقیقی خاکے اور ریسرچ پیپرز جن کے لیے کبھی پردیس تک کی خاک چھاننی پڑتی تھی، معمولی قیمت پر بازار میں تیار ہی مل جاتے ہیں ”ایم فل / پی ایچ ڈی کے تھیسز ہم سے لکھوایئے“ کے خوش کن تین سطری اشتہارات اخباروں اور سوشل میڈیا پر بکثرت دیکھے جا سکتے ہیں اور بعض صورتوں میں تو پوری ڈگری ہی ہمیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے قیمتاً مل جاتی ہے

”میں کہاں کہاں نہ پہنچا تیری دید کی لگن میں“ کے بمصداق بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی؛ ہم تو محض ڈاکٹروں کی بڑی بڑی اقسام ہی ضابطہ تحریر میں لانا چاہتے تھے مگر معاملہ ذرا دور نکل گیا۔

جیسا کہ ہم آگے لکھ چکے ہیں کہ ہمارے ہاں پی ایچ ڈی ڈاکٹرز بھی پائے جاتے ہیں مگر بدقسمتی سے ان کا سوئی، سرنج یا سٹیتھو سکوپ وغیرہ سے بالکل بھی کوئی سروکار نہیں ہوتا اور نہ ہی انہیں کسی قسم کی دوا دارو کا علم ہوتا ہے مگر پھر بھی یہ اسم بامسمی حضرات اپنے ناموں کے ساتھ جلی حروف میں ”ڈاکٹر“ ضرور لکھتے ہیں مضحکہ خیز صورت حال وہاں جنم لیتی ہے جب نام کے آگے ”ڈاکٹر“ کا سابقہ لگا دیکھ کر لوگ ان سے باقاعدہ علاج کے لیے رجوع کرتے ہیں چراغ حسن حسرت صاحب اپنے ”علامہ اقبال“ (مرحوم) کے خاکے میں ایسے ہی ایک دلچسپ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لاہور میں علامہ اقبال کی کوٹھی کے باہر ان کے نام کی تختی ”ڈاکٹر علامہ محمد اقبال“ جلی حروف میں لکھی نصب تھی ایک شخص کے دانت میں شدید درد تھا اور وہ کسی ڈاکٹر کی تلاش میں مارے مارے پھرتے اتفاق سے وہاں آ نکلے تختی پڑھ کر سیدھے کوٹھی کے اندر گھس آئے جہاں حضرت اقبال صحن میں چند دوستوں کے ساتھ تشریف فرما تھے وہ بندے سیدھے حضرت اقبال کی خدمت میں پہنچے اور انہیں اپنے دانت کا مسئلہ پیش کر دیا اقبال بے چارے تو خاموش رہے کہ وہ بھلا کیا جواب دے سکتے تھے مگر حاضرین میں سے کسی نے اس شخص کو سمجھایا کہ دیکھو بھائی! آپ کو شدید غلط فہمی ہوئی ہے یہ وہ والے ”ڈاکٹر“ نہیں ہیں جو دانتوں کا علاج کرتے ہیں وہ آدمی بڑی حیرت سے اقبال کی جانب دیکھتے ہوئے بولے کہ کمال ہے؛ پھر یہ کس قسم کے ”ڈاکٹر“ ہیں جو دانت کا

علاج تک نہیں کر سکتے---!!!

مقام شکر ہے کہ استادوں اور ڈاکٹروں کے علاوہ بھی بہت سارے ''اربابِ فن'' اور ''گوہر یکتا'' سے قدرت نے ہمیں بڑی فیاضی سے نوازا ہے ''میٹرک پاس لڑکے اورلڑکیاں ایک ہی دن میں سوڈالر سے زیادہ کمائیں'' اور ''صرف تین ماہ میں بی اے کا امتحان پاس کر کے ڈگری لے لیں'' کے معجزات کے علاوہ ''حکیم کورس بذریعہ خط وکتابت'' اور ''گھر بیٹھے ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنیں'' کے کرامات ہمارے ہاں ہی تو جنم لیتے ہیں جناب اکبرالہ آبادی (مرحوم) کے مجنوں نے تو فقط اپنی ساس محترمہ کی اس چھوٹی سی شرط پر ''کہ بیٹا! تو اگر ایم اے کرے پاس'' جواباً یہ کہہ کر لیلیٰ سے دستبرداری کا باقاعدہ اعلان کر رکھا تھا کہ:

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفیٰ میرا باحسرت و یاس

....

ہمارے ہر فن مولا ''بنگالی نجومی'' تو فقط ایک ''شف'' اور ایک ہی تعویذ کے ذریعے سنگدل سے سنگدل محبوب کو آپ کے قدموں میں لا پھینک سکتے ہیں ''گھڑیوں کا ہسپتال''؛ ''گوشت کی فیکٹری'' اور ''گاڑیوں کا کلینک'' کے رنگین جلی حرف میں جگمگاتے سائن بورڈ تو آپ نے بھی شہر بھر میں جا بجا لگے ضرور دیکھے ہوں گے۔ پس اس میں فکرمندی یا پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں اللہ کا شکر ادا کریں؛ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں کہ یہی کچھ ہی ہمارے بس میں ہے وہ حکایت تو آپ نے ضرور سنی ہوگی کہ کسی دانا نے ایک پریشاں حال شخص سے پوچھا کہ بھائی! کیوں فکرمند ہو؟ جواب ملا: وطن عزیز کے دگرگوں حالات نے پریشان کر رکھا ہے مرد دانا نے سکون سے پوچھا؛ اچھا! تو کیا ان حالات کی خرابی میں آپ کا بھی کوئی ہاتھ ہے؟ جواب ملا، نہیں تو پوچھا گیا؛ اچھا! تو پھر کیا تم ان حالات کو ٹھیک بنا سکتے ہو؟ پریشاں حال شخص فوراً بولے: جی نہیں؛ میں بھلا کیسے ٹھیک کر سکتا ہوں؛ میری کیا اوقات تب مرد دانا نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اطمینان سے کہا: بندہ خدا! جب حالات بگاڑے بھی تم نے نہیں اور نہ ہی تم انہیں ٹھیک کرنے کی قدرت رکھتے ہو تو پھر پریشانی کس بات کی؟ تم اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟ ملکی حالات کو ذمہ داروں پر چھوڑ دو کہ وہ کوئی حل نکال لیں گے اور تم جاؤ جا کر اپنی زندگی جیو-----!!!

☆☆☆☆☆

اشفاق رشید: مصاحبت کا ایک عہد

اس پیارے شخص سے تعارف اسی کی دہائی کے آخر میں ہوا تھا، یعنی کوئی پینتیس چھتیس برس قبل اور 'سانحہء دوستی' کا آغاز بھی اسی دن سے ہو گیا۔ مطلب یہ کہ دو طرفہ رسمی تعظیم نے روزِ اول سے طویل رخصت حاصل کر لی۔ پھر روزگار نے ہمارے بیچ کئی شہروں کی مسافت حائل کر دی۔ یوں آبرو کی بحالی ایک تجربہ بن کر گویا زندگی میں شامل ہو گئی لیکن تقدیری فیصلوں کی اپنی ہونیت چلی آ رہی ہے۔ بارہ تیرہ سال پہلے راقم کو محکمانہ تبادلے سے دوچار ہو کر راوی روڈ کالج جانا پڑا جس کا پہلا صلہ یہ ملا کہ گیٹ پہنچتے ہی سامنے جنوری کی دھوپ میں اپنی سنہری شخصیت کی دھوپ کا پیوند لگائے اشفاق رشید براجمان تھا، جملہ شرارتوں سمیت۔ اب:

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن

....

جلدی سے اسے گلے لگا کر اپنے تئیں ایک واردات ترتیب دی: صدر شعبہ ہونے کے باوصف میں اب بھی تمھارے لیے دوسروں کی عدم موجودی میں وہی پرانا 'تم' ہی رہوں گا؛ سو، کوئی تکلف نہیں ____ لیکن بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کیا؛ یہ حربہ قطعاً کام نہ آیا کہ اس کی نظر میں دوسرے موجود ہونے کے باوجود کبھی موجود نہیں رہے۔ خیر! وقت بھری بزم کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مذکورہ 'تو تیرا ہی' میں گزرتا رہا۔ اسی اثنا میں اس عاجز کو وہیں راوی روڈ کالج میں وائس پرنسپلی کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ اگلے دن جب اپنے معمول کے مطابق شعبے کے اکلوتے کمرے میں گیا تو بولا: اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں، جاؤ جا کر اپنے کمرے میں بیٹھو! اس برجستہ 'عزت افزائی' کے علی الرغم دل کو قدرے طمانیت بھی محسوس ہوئی کہ وہاں دوسروں کا نہ ہونا ممکن ہے مفید ہی رہے؛ پر اسے بھی

جمیل احمد عدیل

کہاں چین تھا؛ آکر بلا تمہید حکم صادر کرتا:
چلو شاہدرہ ریلوے سٹیشن پہ جا کر بیٹھتے ہیں۔
اس طرح چند دوست وہاں پلیٹ فارم پہ جا کر وقت گزارتے اور اس کے 'متین اسلوب' کو وافر حریت کے ساتھ اظہار کے قرینے میسر آتے رہتے۔ اندر سے ایک آواز سی اٹھتی تھی کہ ہر شے کا ایک انت ہے؛ یہ سلسلہ کبھی تو اپنے انجام کو پہنچے گا؛ پھر وہی ہوا کہ اک اور ٹرانسفر کا سامنا تھا منیر مجھ کو! اب اسلامیہ کالج اگلی منزل ٹھہری تو اداکاری کرتے ہوئے اس سے کہا: اشفاق! تم بہت یاد آؤ گے، بہر حال تبادلہ ملازمت کا حصہ ہے لیکن دل سے خوش تھا کہ میرے بعد کس کو ستاؤ گے! ابھی اس نئے ادارے میں تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ ایک روز اس کی فون کال آئی: 'میری پرموشن ہو گئی ہے، کیا تمھارے کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی سیٹ ہے؟' جھوٹ بولنے سے حاصل کچھ نہیں تھا، کسی اور کالج میں پوسٹنگ کا مشورہ بھی اس نے کب ماننا تھا چنانچہ اگلے دن یہ اسلامیہ کالج میں جوائننگ دے چکا تھا۔ اپنی مخصوص شریر ہنسی کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ میں پہلا قدم دھرتے ہی بولا: تم کیا سمجھتے تھے، مجھ سے بچ کر نکل جاؤ گے؟! نئے احباب کی سماعت سے یہ صیغہ ٹکرایا تو یوں جانیے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا کہ انھیں زبانِ غیر سے شرحِ آرزو کی سہولت بیٹھے بٹھائے مل گئی تھی۔ رونما ہو کر اسے خوش آمدید کہا، کسی اور ہدایت کی احتیاج ہی نہ تھی کہ اس نے بغیر خارجی مدد کا احسان اٹھائے خود ہی وہیں سے سلسلہ جوڑ لیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ مقدر سے مفر نہیں! اس مجہولی فلسفے کو قبولتے ہوئے نوکری جاری رکھی اور اس سے 'بائی لیٹرل ریسپیکٹ' کی بے بضاعتی کا تماشا دکھاتے ہوئے مکالمہ زور و شور سے روزانہ برقرار رہتا۔

حقیقت یہ ہے بعد دوپہر اور کبھی سہ پہر گھر واپسی کو ہم ماندگی کا وقفہ ہی سمجھتے تھے، اگلا دن آتے ہی وظیفہ اپنے ازلی استمرار پر عمل پیرا ہو جاتا۔ جی ہاں! اپنی کامل استقامت یعنی ڈھٹائی کے ساتھ۔ یہ ساری صورت حال دیگر احباب کے لیے از حد حظ کا باعث ہوا کرتی تھی۔ امر واقع یہی ہے کہ شعبے میں ناگزیر تکلفات بھی نہ تھے اس لیے سے کی دلکشی گھروں کے غم دھوئیں میں اڑا دیتی تھی۔ اس مجازی دھوئیں پر حقیقی دھواں مستزاد کہ اتنے سگریٹ پورے کالج میں نہ پھونکے جاتے ہوں گے جتنے اکیلے شعبہ اردو میں! حتیٰ کہ دیگر ڈیپارٹمنٹس کے جو خائف اصحاب تمباکو نوشی 'بوجوہ' افورڈ نہیں کرتے تھے وہ بھی اپنا شوق دودکشی یہیں آ کر پورا کر لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ویویک مرتھی کا کہنا ہے تنہائی میں جینا روزانہ پندرہ سگریٹ پینے کے مترادف ہے۔ اپنے سموکر دوستوں

کو دیکھ کر داد دینے کو جی چاہتا تھا کہ وہ کس خوبی سے اپنی جلوت کو خلوت میں تبدیل کر لینے پر قادر تھے۔ اشفاق سادہ سگریٹ ہی نہیں پیتا تھا بلکہ سنگین دھوئیں کا رخ بھی اس خاکسار کے رخ کی جانب رکھ کر ثواب دارین کا قائل تھا نیز اس مسلک کی 'کو سگریٹریز' کو بھی تبلیغ ضروری سمجھتا تھا مگر بھلا ہو اورنگ زیب نیازی صاحب اور عارف مغل کا کہ وہ عمدہ تربیت کے کارن اپنے جذبہ احترام سے بھی دستکش نہ ہوئے وگرنہ اس نے انھیں بہکانے کی ہر ممکن مساعی کیں۔

مارکیٹ میں بھلی مانس کاریں دستیاب ہونے کے باوجود ڈیشنگ جیپ کا دلدادہ؛ لاؤڈ رنگوں پہ جی جان سے فدا؛ جی جناب! شوخ و شنگ، شور مچاتے اور چست پہناووں نیز چیخ والے شوز کا شوقین اشفاق بلاشبہ خوبیوں والا آدمی ٹھیرا؛ جس میں سرفہرست وصف اس کا فیاض ہونا ہے۔ درجہ چہارم کے ملازمین کا مستقل مددگار؛ دوستوں پہ خرچ کرنے والا؛ ویلیو ایڈیشن پر عامل؛ اپنے ہوتے ہوئے چائے کا بل کسی اور کو ادا نہیں کرنے دیتا تھا۔ واضح رہے ہمارا یہ معصوم حبیب بائی نیچر دیالو ہے۔ جود وسخا کے جام لنڈھاتے ہوئے مس عیب کو گولڈ میں کنورٹ کرنے والا آرٹ فل الکیمسٹ نہیں۔ یہ کون سا سیاستدان ہے جسے اس سرمایا دارانہ حیلے سے اپنے قبائح کو Blur کرتا ہے۔ دوست شاہد ہیں اس معاملے میں اپنا اشرف زاہد بھی Giver's Mind رکھتا تھا مگر ہم اہل شعبہ اس اہل کتاب کی طرف سے بل کی رقم کو جزیہ یقین کر کے اپنے قلوب پر کبھی بوجھ نہیں آنے دیتے تھے کہ راسخ اعتقاد کے بہر حال کچھ لازمی تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ دراصل شروع ہی میں اشرف زاہد نے ایک روز ہنستے ہنستے پوچھ لیا تھا:

ایمان لاؤں تجھ پہ کہ جزیہ ادا کروں

....

اور ہم نے بھی بغیر ہنستے ہنستے اسے اپنا اجماعی فیصلہ سنا دیا تھا:

جزیہ

یوں ہم اہل صفا اپنے ذمی کے مقروض قرار نہیں دیے جا سکتے کہ چائے / پکوڑوں / سموسوں / فرنچ فرائز کے عوض اسے امان بھی مہیا کر رکھی تھی۔ مجال ہے کسی ایماں کی حرارت والے نے کبھی اس کی جانب میلی آنکھ سے بھی دیکھا ہو: تم اپنے نظریے پاس رکھو ہم اپنا نظریہ رکھتے ہیں۔

اشفاق کے جمالیاتی ذوق کو مذکور کیے بنا یہ اجمال زیادہ ہی ادھورا رہے گا۔ یہ ہر لوہے پتھر بجری سیمنٹ کی چیز میں سے بھی پرکشش بلکہ اپنی دانست میں گداز گوشہ ٹٹول لیا کرتا تھا۔ چاہے وہ آہنی ٹرین کا عقبی حصہ ہی کیوں

نہ ہو۔ چاہے وہ کسی گاڑی کی مخصوص گولائیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ چاہے وہ کسی ہیوی بائیک کی جارحانہ لک ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے وہ کسی سڑک کے نشیب و فراز ہی کیوں نہ ہوں۔ لامسہ اس کے حواس میں سب سے حساس سینس مقرر ہے، آپ سمجھ گئے ہوں گے ملمس سے وابستہ مطالبات کو اس نے کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ممکن ہے کسی پڑھے لکھے کو یہ صورت حال Objecto philia کے مشابہ محسوس ہو، تاہم اس باب میں حتمیت ادعائی سے تعبیر ہوگی۔ راوی روڈ کالج میں اس نے اپنے ہاتھوں سے پودے درخت لگائے اگائے اور گارڈن کی تزئین کاری سے محبان کی نگاہوں کو موہ لیا۔ موخرالذکر ادارے میں بھی باغبانی اس کے فرائض میں شامل تھی، جسے اس نے دلبستگی سے نباہنا چاہا۔ اشفاق وہ ماحول دوست اور حسن آرا ہے کہ اگر قدرت اسے فارم ہاؤس میں رہنے بسنے کا موقع دے تو یہ اسے بہشت کا ٹکڑا بنا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یاد بخیر! اشفاق کی کالج آمد بڑی غضب ناک ہوا کرتی تھی۔ یوں پیر پٹختا ہوا آتا جیسے غصے کے شعلے سے جلتے کو جلا رہا ہو۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی شہر کی بے ہنگم ٹریفک اور گریٹر اقبال پارک کی چار دیواری سے متعلق اس کے ارشادات عالیہ میں برہنہ دشنام کے پہلو اس قدر نمایاں ہوتے تھے کہ سب کے اجتماعی دکھ کا ایکدم تزکیہ کر جاتے؛ پھر یہ کچھ اسی بے حجاب لب و لہجے میں پانی طلب کرتا؛ دو گلاس پی کر سگریٹ سلگاتا؛ اس طرح دس ہی منٹ میں چہکنے لگتا اور سب اس بلبل ہزار داستان سے ماضی کے قصے سن سن کر لطف کشید کرنے لگتے۔ بالخصوص حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ فتوحات سامعین کے لیے ہمیشہ ولولہ انگیز ثابت ہوتیں۔

ہے تو یہ ذاتی سا قضیہ لیکن اس کا بیان شاید ایسا بے محل نہ ہوگا۔ راقم آثم مدت العمر اپنی جبلی/طبعی جھجک پر غالب نہیں آسکا۔ سچ یہی ہے جہاں کھل کر اپنی بات کہنے کا موقع ہوتا ہے وہاں بھی جھینپ جاتا ہوں۔ اشفاق رشید پر نت رشک آیا کہ اکثر ہر نوع کے ستر کو تفریق کرتے ہوئے عین مین وہی کہہ ڈالتا، جو اس کے دل میں ہوتا اور الفاظ کو محجوب کرنا تو اس کی نظر میں سدا بالکل بے معنی رہا۔ ڈکیتی کا سامنا کرنا Traumatic ہوتا ہے لیکن اس نے ان لمحوں میں بھی گنوار سے ڈاکو کو مناسب سی گالی دے کر سگریٹ پینے کی اجازت طلب کی تھی۔ اندوہ و کرب کی حالتوں میں کئی بار من میں آئی کہ اس سے کمک طلب کروں:

تمہیں غم کی قسم اس دل کی عریانی مجھے دے دو

....

لیکن حرفِ مدعا کبھی زبان پر نہ آسکا، اس لیے کہ اساسی اہلیت نہ ہونے کے سبب غالباً یہ وہ نغمہ ہے جو اس خاکسار کی زبان پیش کرنے سے دائم قاصر ہی رہے گی۔

اشفاق کی حساسیت صدفی صد ایک خالص آرٹسٹ والی تھی۔ زود رنج تھا مگر طبعاً علامہ اقبال کا طفلِ شیر خوار ہی ثابت ہوا:

جلد آجاتا ہے غصہ، جلد من جاتا ہوں میں

....

مجھ سے سو بار ناراض ہوا اور دو سو مرتبہ مان گیا۔ بھیتر میں کدورت رکھنے کے 'ہنر' سے یکسر تہی! Tender Hearted اور ایثار کا پیکر تو کوئی اس سا کہاں ہوگا! اخلاص اور رحم دلی واقعتاً اس کی سرشت کے لاینفک اجزا ہیں۔ یوں اس کی خفگی مدام مغلوب رہنے کا وصف (رفتہ رفتہ) سیکھ گئی ہے۔ اسی لیے دوست اس آتم کامیہ سے بلا جھجک دکھ سکھ کر لیتے ہیں:

القلب کالعصفور

یہبطُ فی المکان الذی یشعرُ فیہ بالأمان

دل چڑیا کی مانند ہے

وہاں اترتا ہے جہاں وہ خود کو محفوظ تصور کرتا ہے

دوستوں میں اشفاق رشید کے متعلق عمومی تاثر بھی ہے کہ وہ ایک جملہ باز، چٹکیلا، بچولیا، سیلانی، لاأبالی، ووکل، چھلباز، چٹخے بولنے والا، بزم آرا قسم کا شخص ہے لیکن میں اس کے خاص Wisdom Level کا بھی قائل ہوں۔ کئی سال پرانی بات ہے، ایک دن ہم دونوں ہی تھے کہ اس نے مجھ سے پوچھا: اپنی تنخواہ میں سے والدین کو بھی کچھ بھیجتے ہو؟ میں نے کہا: کبھی نہیں کہ انھیں ضرورت ہی نہیں۔ کہنے لگا: بھلے ہی انھیں ضرورت نہ ہو، تم ایک حصہ مقرر کر کے لازماً باقاعدگی سے ہر ماہ بھیجا کرو! معلوم نہیں کیوں اس کی نصیحت کا اس وقت میری روح پر خاص اثر ہوا۔ جب اس پر کاربند ہوا تو دل Serotonin کے طفیل اس قدر مسرور رہنے لگا کہ ناقابلِ بیان! جیسے ذات نے نشوونما کے متعدد مراحل ایک جست میں طے کر لیے ہوں۔ باقی اس برکت کو بائی پروڈکٹ ہی کہیے کہ اس کے بعد مجھے کسی سے قرض مانگنے کی نوبت نہیں آئی ورنہ ہر مہینے کا آخری ہفتہ ادھار کے پیسوں ہی سے چلتا تھا۔ یہ قلبی نشاط کا معاملہ تھا؛ یوں کبھی کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا: آج چونکہ اشفاق کا اعتراف کر رہا ہوں اس لیے اُس کا یہ کریڈٹ پردۂ اخفا میں رکھنا مناسب نہ لگا۔

اشفاق ایک زمانہ اُردو کا مدرس رہا لیکن اسے انگلش زبان پر بھی دسترس حاصل ہے، لکھنے اور پڑھنے ___ دونوں میں ___ ہو سکتا ہے سننے کے لحاظ سے بھی ہو لیکن اس باب میں کچھ تردد یوں پوشیدہ رہتا ہے کہ درونِ محفل یہ کسی بھی زبان میں بات چیت سننے کا عموماً روادار نہیں ہوتا۔ رموز اوقاف سے بے نیاز ہو کر اور شعور کی رو سے مستفید

ہوتے ہوئے اس کا بے تکان اور Antithetically بولنا احباب کو خوب مزا بھی دیتا تھا کہ شگفتگی اس کے مزاج کا سرمدی جزو ٹھیری۔ بیچ بیچ میں ناگفتنی مگر لذیذ ٹوٹوں کو یوں ٹانکتا چلا جاتا کہ سب لوٹ پوٹ ہو ہو جاتے! بہر صورت اس کا متجاوز و متبائن کلام دوستوں کو جہاں تفریح سے ہمکنار کرتا وہاں وہ ارتباط کی جستجو کرتے کرتے جب معکوس سمتوں کو تگ و تاز کے بعد مرتب وحدت میں پرو لیتے تو دفعتہً سرشار ہو جاتے۔ ایسے میں ممکن ہے ریمنڈ کارور کے یہ الفاظ انھیں تقویت دیتے ہوں:

"Pieces of the Story began to fall into place."(Cathedral)

اپنے فکشن میں بھی اس نے حسبِ ضرورت مذکورہ تکنیک کو کلاکاری سے برتا ہے۔ قاری خواندگی کے دوران بہت سارے ماجروں سے دوچار ہوتے ہوئے، آخر میں اس مرکزی کہانی کو پالیتا ہے جو پورے متن میں جاری تھی مگر مستور ہو کر۔ ذہین ریڈر پر جب مخفی رکھے گئے معمے کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ فکشن رائٹر کی مہارت کا قائل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فکشن کی شعریات سے واقف ہی ٹکڑوں میں بٹی اس کی گفتگو سے صحیح لطف اندوز ہوتے تھے۔

جب کسی سفید بھوؤں والے ثقہ ادیب شاعر سے یہ بذلہ سنج ہاتھ ملا رہا ہو اور اسی اثنا میں معمر و معتبر شخصیت کے ماتھے پر عرقِ انفعال کے موتی یکا یک نمودار ہونے لگیں تو محرم راز فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اس ظریف کی انگشتِ شہادت کے خمار زاویے نے مظلوم ہتھیلی پر اپنا مرغوب فعل آغاز کر دیا ہے۔ حقیقت یہی لگتی ہے ایسے مواقع پر ان بزرگ کی بے بسی بھی کہیں تہوں کے اندر حالتِ حظ میں ہوتی ہوگی کہ بہر طور اس شہزادے کو خوب چاہا گیا ہے۔

اب یہ ہو گیا ہے ریٹائر ____ تو خیال آتا ہے کہ آنے والے وقت میں یہ خوبرو کیا کرے گا؟ اس میں فکرمندی والی بات اس لیے نہیں کہ یہ بہت فیملی اورینٹڈ ہے۔ اپنی اولاد کے حق میں بے حد Loving Father- بچوں کو گھمانے پھرانے کے لیے شمالی علاقوں میں جاتا رہتا ہے۔ اب سیاحت کے واسطے اسے کھلا وقت ملے گا۔ سو، میری طرف سے تاکید بھی یہی ہے کہ 'سیروفی الارض' کے امر پر عامل رہے۔ البتہ فلم Joggars Park والا وکٹر بینرجی بننے کی کوشش نہ کرے کہ یہ 'Attempt' قابلِ دست اندازی 'پولیس' سمجھی جائے گی۔ باقی کسی Perizaad Zorabian کی سنگت کے بغیر سادہ جوگنگ میں کوئی

مضائقہ نہیں ــــــ چلیے مان لیا سیر چمن کے دوران ایک فاصلے سے گل رخوں کی دید (Voyeurism) بھی اوکھے سوکھے گنجائش نکال سکتی ہے کہ یہ ایسا کوئی گہرا بھید تو نہیں کہ مدت ملازمت کی تکمیل زیست کا خاتمہ ہرگز نہیں۔ اس فقیر کے اپنے سرور اور اپنی بے فکریاں ہیں۔ جس کا ایک علامتی زاویہ یہ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اشفاق کے لاسٹ ورکنگ ڈے (یکم مئی) کو ریٹائرمنٹ کے عرصے میں ضم کر کے گویا ملنے والی آزادی کے دور کو بڑھا دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ معاملہ جیز کمپنی کی جانب سے ملنے والے ان دس مفت منٹوں جیسا ہے؛ جنھیں صارف تین منٹ میں خرچ کرنے پر پابند ہوتا ہے؛ علاوہ ازیں یہ ہدیہ ملتا بھی تب ہے جب کنزیومر کے پاس ہینڈسم پیکیج پہلے سے موجود ہو۔

یاد آیا! اشفاق کے پاس نادر تصاویر کا خزانہ بھی محفوظ ہے ـــ چونکہ شروع ہی سے یہ مجلسی آدمی ادبی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کرتا رہا، اسی لیے یہ اپنی گھنیری مونچھوں سمیت ان ادبی مشاہیر کے ساتھ فوٹو میں بنفس نفیس موجود دکھائی دیتا ہے جن کے تذکار ہم نے صرف کتابوں میں پڑھ رکھے ہیں۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کے بقول اشفاق رشید کی کوئی نہ کوئی تصویر بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ بھی یقیناً نکل آئے گی۔ لہٰذا یہ چاہے تو دوبارہ سماجی روابط بحال کر کے قلم قبیلے میں از سرِ نو سرکردہ حیثیت حاصل کر سکتا ہے کہ آج بھی عبقری منڈی میں اسے سب جانتے ہیں۔

بہر رنگ ہمارا یہ دوست جیے خوشیوں کے ساتھ! اور اس گمشدہ ادیب اشفاق رشید کو نئے سرے سے دریافت کرے جس نے اس زمانے میں افسانے / ناول ۳ کے ذریعے اپنی مستحکم پہچان کرائی جب ہم ابھی طفل مکتب تھے۔ ہاں اشفاق! تم اب بھی جو چاہو بن سکتے ہو کیونکہ تم مضبوط ہو! سو، ہمت ہرگز نہ ہارو کہ تم زرخیز ہو، اصولی طور پر ابھی Creative Menopause کا زمانہ تم سے کوسوں دور ہے!!!

حواشی

(۱) انگلش میں اس کی تصانیف:

Art in Pakistan(2010)

Contemporary World of Urdu Literature (2014) کو قارئین نے ہمیشہ قدر کی نظر سے دیکھا۔

۲ ’’کہانی کے ٹکڑے اپنی جگہ بیٹھنے لگے۔‘‘

۳ بادشاہ تماشا اور فن کار (۱۹۹۶ء۔ ۲۰۲۰ء)

شدت (۱۹۹۸ء۔ ۲۰۲۰ء)

☆☆☆☆☆

ادبی متقی زاہد / ہمایوں پرویز شاہد

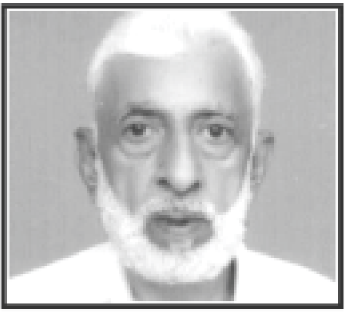

ہمایوں پرویز شاہد سے میری پہلی ملاقات پروفیسر عاشق راحیل کے امیر خانے پر ہوئی اور وہاں میں اُستاد اعظم قبلہ اقبال راہی کی انگلی پکڑ کر گیا تھا اقبال راہی کی انگلی پکڑ کر منزل پر پہنچنا بہت ہی آسان کام ہے کہ یہ ہمیشہ انگلی پکڑاتے ہیں راستے میں انگلی نہیں کرتے۔ بس اسی آسانی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں جس محفل شعر سخن میں حاضر ہوا، وہاں ہمایوں پرویز شاہد نے اتنی محبت، سے استقبال کیا کہ میرے لیے یہ یقین کرنا ذرا مشکل ہو گیا کہ یہ بندہ بذات خود شاعر بھی ہے، اُن کا مخاطب کرنا، کہ او ہو ماشاءاللہ رضوی صاحب تسی ساڈے سر دا تاج او میں تہنوں جان ناں واں، تہانوں مل کے بڑی خوشی ہوئی پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کر مجھے اتنی زور سے گلے لگایا کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ دن پھر کی پہلی مردانہ جپھی حاصل ہوئی ہے۔ پھر اسی پہلی جپھی کے زیر اثر اُن سے مسلسل جپھیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی حلقہ ارباب ذوق کے تنقیدی اجلاس میں کبھی ادبی تقریبات میں، اسی لیے پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سادگی خاکساری محبت خلوص اور شعر و سخن میں گندھا ہوا اصل انسان، ہمایوں پرویز شاہد جیسا ہوتا ہے ایک مشاعرے کی نظامت کے دوران میں نے ہمایوں صاحب کو اس طرح دعوت دی، کہ حاضرین وقت کی کمی ہے اس لیے میں بیک وقت دعوت دے رہا ہوں تشریف لاتے ہیں ہمایوں پرویز شاہد میرے یوں مخاطب کرنے پر ہمایوں صاحب نے پہلے تالیاں بجائیں کچھ انتظار کیا پھر حیران ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور جلدی سے

اعجاز رضوی

اُٹھے اور بولے او مینوں بلایا مینوں بلایا کمال اے کمال اے پھر اسٹیج پر آ کر اپنا کلام سنانے لگے، ان کے کلام سنانے کا انداز بھی نرالا ہے، یہ پہلے ہاتھ میں پکڑے شاپر سے تہہ شدہ کاغذ نکالتے ہیں پھر اُن کو یوں غور سے دیکھتے ہیں جیسے کسی اور سے لکھوا کر لائے ہوں پھر ایک کاغذ منتخب کرتے ہیں، اور مخاطب ہوتے ہیں، نعت کے کچھ شعر نعت کے بعد کہتے ہیں، ایک اُردو غزل، پھر غزل کے بعد کہتے ہیں، ایک پنجابی غزل اجازت اے، پھر بغیر اجازت ہی پنجابی غزل بھی سنا دیتے ہیں اپنی ہر شائع شدہ کتاب کو لوگوں میں یوں تقسیم کرتے ہیں کہ لگتا ہے بس میں جنتری بیچ رہے ہوں۔

یہ بغل میں کتابیں دبا کر یوں چلتے ہیں جیسے کتابوں کو دودھ پلا رہے ہوں اُن کی کتابوں اور ایوارڈوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آسانی سے یاد نہیں ہوتی اس لیے تعداد بتانے کے لیے انھوں نے اللہ کافی اللہ شافی والے طفیل شافی کو رکھا ہوا ہے۔

ہمایوں پرویز شاہد کے دعا اور داد دینے کا انداز بہت انوکھا ہے لگتا ہے کچھ مانگ رہے ہیں یہ اپنے سے چھوٹوں کو یوں دعا دیتے ہیں تسی ساڈا مان او، اللہ تہاڈا سایا ساڈے سر تے قائم رکھے گویا چھوٹے کی صحت و سلامتی کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی لائف ٹائم چیلنج۔ ہمایوں پرویز شاہد شعر پر داد دینے سے پہلے اپنا سر ہلا کر شاعر کو یقین دلاتے ہیں کہ شعر ٹھیک ہے پھر شاعر کے منہ سے مصرعے کا آخری حرف سن کر اس کو دہراتے ہیں اور کہتے ہیں، واہ اچھا اے اگر ان کی داد پر خود شاعر سر نہ ہلائے تو یہ یوں ہاتھ بڑھاتے ہیں جیسے داد وصول واپس مانگ رہے ہوں۔

یہ جلدی سے ٹی ہاؤس میں داخل ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے جرس چھپا کر لا رہے ہوں، اور جب یہ ٹی ہاؤس سے واپس جاتے ہیں تو پہلے پورے ٹی ہاؤس کو دیکھتے ہیں، پھر یکدم دروازہ کھول کر یوں تیزی سے چلتے سڑک پار کرتے ہیں کہ لگتا ہے چمچے چرا کر بھاگ رہے ہوں دوسروں کی شاعری سنتے ہوئے اکثر گہری نیند سو جاتے ہیں جبکہ اپنی شاعری سناتے ہوئے یوں بیدار ہوتے ہیں جیسے صدیوں سے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

ہمایوں پرویز شاہد خود پہلوان نہیں مگر انکے والد صاحب باقاعدہ پہلوان تھے۔ اور انکی پوری کوشش تھی کہ ہمایوں کو بھی لوگ ہمایوں پہلوان پٹھا جلال پہلوان کے نام سے پکارے، مگر ہمایوں صاحب پہلوانی کو چھوڑ کر شاعر بن گئے اور ہمایوں پٹھا جلال

پہلوان کے بجائے ہمایوں پٹھا پنجاب پہلوان ٹھنڈی کھوئی اُردو والے بن گئے اور پھر اُردو پنجابی دونوں زبانوں میں لکھنے لگے اور تا حال لکھ رہے ہیں۔

ہمایوں پرویز شاہد اندرون شہر بھاٹی کے ایک قدیمی انسان ہیں، اس لیے قدیمی انسان کی طرح آج بھی محنت مزدوری کرتے ہیں، اور اسی کا چرچا بھی کرتے ہیں حالانکہ آجکل یہ خاصے کھاتے پیتے گھرانے کے فرد ہیں، اُسی لیے دوسروں کو کھلاتے پلاتے بھی خوب ہیں اگر یقین نہیں آتا تو عقیل شافی کو دیکھ لیں۔

اُن کی ایک کتاب گلشن ادب والوں نے چھاپی تھی اور اس کے ٹائٹل پر جو تصویر لگائی تھی وہ تصویر خود بتا رہی تھی کہ یہ سبب تہی ہو نہیں بل کہ سبب یہ خود ہے والا کام تھا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ ہمایوں پرویز شاہد نے پبلشرز بدلے پھر خود کو بھی بدلا اور اپنے ٹائٹل بھی بدل دیے، یہ خوب پیدل چلتے ہیں۔ اُسی لیے عمرہ کرنے کے بعد، ان کی شخصیت میں پھرتی اور تبدیلی: ایف 16 کی رفتار سے ہوئی اگرچہ ان کی شاعری میں محبت کے جذبات کے ساتھ ساتھ بنیادی انسانی مسائل کا ذکر تو پہلے بھی کافی دبنگ انداز میں نظر آتا ہے مگر بعد کے اشعار نے تو کمال ہی کر دیا۔ وہ کہتے ہیں:

سچ کی پاداش میں ہم سولی پہ چڑھ سکتے ہیں
جھوٹ سے صاحبِ دستار نہیں ہو سکتے

خود سے جو برسرِ پیکار نہیں ہو سکتے
وہ کبھی آئینہ بردار نہیں ہو سکتے

زندگی خالی مکاں ہے دوستو
اس میں یادوں کو بساتے جائیے

تیرا چہرہ گواہی دے رہا ہے
ترے اندر حیا کی روشنی ہے

....

یہ (مرحوم) منظور وزیر آبادی کے شاگرد عزیز ہیں اس لیے میں نے انھیں کبھی نا منظور نہیں کیا بل کہ انھیں اس حد تک منظور کیا کہ اگر آج ہمایوں بادشاہ کی تقریب تاج پوشی بھی ہوتی تو میں وہاں بھی نہ جاتا کیونکہ مجھے تو ہمایوں پرویز شاہد کی تقریب میں آنا تھا، اور وہ بھی اس لیے کہ ہمایوں ہو گا۔ ہندوستان کا بادشاہ مگر ہمارے دل کے بادشاہ تو ہمایوں پرویز شاہد ہیں، سو بادشاہ سلامت ہماری اطاعت محبت اور مبارک باد قبول فرمائیں کہ آپ ہی تو ادبی متقی زاہد ہیں، کیونکہ آپ ہی ہمارے ہمایوں پرویز شاہد ہیں۔

☆☆☆☆☆

ہانکا

کہیں ہانکا لگایا جا رہا ہے
پرندے اڑ رہے ہیں
یہ کس کی موت کا ہانکا لگایا جا رہا ہے
کہیں گھنگھرو، کہیں خالی کنستر بج رہے ہیں
کہیں خندق، کہیں خس پوش کھڈ ہے
کہیں پنجرے، کہیں پھندے چھپے ہیں
کہیں نعرہ، کہیں بارود داغا جا رہا ہے
صفیں آراستہ ہیں
یہ کس کو مل کے گھیرا جا رہا ہے
نگہبانو! گنہ گاروں کی جانب دیکھتے رہنا
گنہ واپس نہیں ہوتے، عمل مٹنے نہیں پاتے
تمنائیں کبھی پوری نہیں ہوتیں
تنے کے ساتھ بکروٹا بندھا ہے
درختوں پر مچانیں کس نے باندھیں
مچانوں پر شکاری کون لایا

نگہبانو! گنہ گاروں پہ دم دم آنکھ رکھنا
گنہ واپس نہ ہوں گے
عمل مٹنے نہ پائیں گے، تمنائیں کبھی پوری نہ ہوں گی
درختوں کے تنوں کے ساتھ بکروٹے بندھے ہیں
درختوں پر شکاری منتظر ہیں
نہ جانے شیر کس جانب سے نکلے
نہ جانے موت کس پہلو سے آئے
یہ دل بھی ایک ہرنوٹے کا دل ہے
اچانک کب دھڑک کر بیٹھ جائے
یہ کس کی موت مجھ کو گھورتی ہے
یہ دل گھبرا رہا ہے
کہیں گھنگھرو، کہیں بارود کام آ رہا ہے
تنوں کے ساتھ بکروٹے بندھے ہیں
شکاری کے تعاقب میں شکاری آ رہا ہے
صفیں آراستہ ہیں

خالد احمد

یہ کس کو مل کے گھیرا جا رہا ہے

کہیں گھنگھرو، کہیں خالی کنستر بج رہے ہیں

کہیں خندق، کہیں پھندا، کہیں خس پوش کھڈ ہے

کہیں نعرہ، کہیں بارود کام آ رہا ہے

درختوں سے، مچانوں سے، گھنیری جھاڑیوں سے

ہر اک پتے کے پیچھے سے، ہر اک پتے کے نیچے سے

یہ کس کی موت ہم کو گھورتی ہے

ہمیں کس سمت ہانکا جا رہا ہے

کہیں بارود داغا جا رہا ہے

پرندے اُڑ رہے ہیں

گراں جانو! زیاں کارو! سنبھلنا!

ابھی ہانکا ہنکایا جا رہا ہے

نگہبانو! گنہ گارو! سنبھلنا!

ابھی ہم کو تھکایا جا رہا ہے

گراں جانو! زیاں کارو! نگہبانو! گنہ گارو! سنبھلنا

ہمارا تن، بہت آہستگی کے ساتھ ڈھایا جا رہا ہے

ابھی ہم کو تھکایا جا رہا ہے

اسفل السافلین

نفرت کے آسماں سے
گراؤ ہو بم پہ بم
اور اڑتے لوتھڑوں سے
کشید و ہولتیں
یک طرفہ قتلِ عام ہے
یہ جنگ ہے کہاں
سفاکیوں کے ثبت کیے
تم نے جو نشاں
ایسا زمیں پہ وقت نے
دیکھا ہے کب سماں
چھوڑو ہو ہسپتال نہ مسجد
نہ کوئی گھر
بوڑھے، جوان، مرد و خواتین
اک طرف
پھولوں سے شیر خوار گروہو
لہو میں تر
دیکھا ہے جنگلوں نے بھی
منظر یہ بارہا
ایسا بہیمیت میں بھی
آتا ہے مرحلہ
بھر جائے جانور کا بھی دل
چیر پھاڑ سے
آخر وہ جا کے پیڑ کے سائے میں
بیٹھ جائے
نسلی مفاخرت کی
گھاؤں کے ساکنو
کس منہ سے اپنے آپ کو
انسان کہہ سکو
یوں شیطنت کے
اسفل سانچے میں ڈھل گئے
تم بھیڑیوں سے بھی
بہت آگے نکل گئے

جلیل عالی

نظم [سبطین شاہجہانی کی نذر]

جو مراسم میں محبت کی ادا رکھتا ہے
اپنے ہمراہ جو خوشبو کی فضا رکھتا ہے

دوستوں سے جو ملیں زخم، چھپا رکھتا ہے
اپنی جانب جو ہر اک رستہ کھلا رکھتا ہے

گلشنِ شعر و ادب کا گلِ صد رنگ ہے جو
اپنے ہر لفظ میں جو پھول کھلا رکھتا ہے

دوستی میں ہے جو اک شاخِ لچکدار ایسا
پر اصولوں پہ قیامت کی انا رکھتا ہے

جس کے ہر شعر کا مفہوم بنائے تصویر
حرفِ اظہار میں جو حسنِ ادا رکھتا ہے

نعت کہنے کا ہے اسلوب اچھوتا جس کا
جو غزل گوئی میں انداز جدا رکھتا ہے

دوستوں پر تو عنایات کا کیا ذکر، کہ جو
دشمنوں کے لیے وا دستِ دُعا رکھتا ہے!

نذر یہ شعر مرے ہیں اسی سبطین کے نام
حرفِ اظہار میں جو حسنِ ادا رکھتا ہے

اسی سبطینؔ، غلامِ شہِ کونینؐ کے نام
نعت کہنے میں جو انداز جدا رکھتا ہے

اسی سبطینؔ گدائے درِ حرمین کے نام
اپنے ہمراہ جو خوشبو کی فضا رکھتا ہے

نسیمِ سحر

اور دسمبر جا رہا ہے (عرش صدیقی کی نذر)

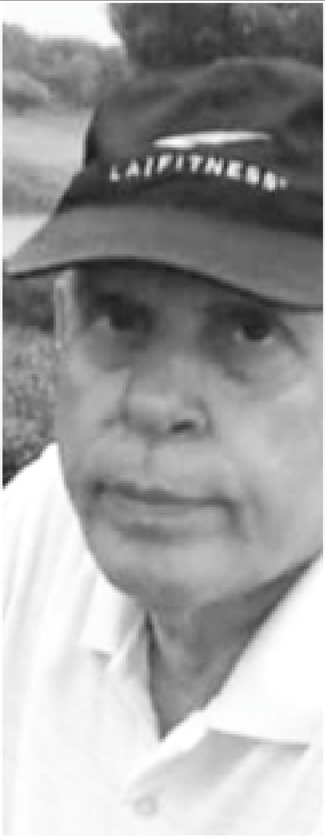

اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے
دسمبر نام ہے سوئی ہوئی خواہش کی حُرمت کا
دسمبر نام ہے اُلجھی ہوئی سوچوں کی غُربت کا
دسمبر درد کے بیدار ہونے کا مہینہ ہے
دسمبر مُنتشر ہو کے بکھرنے کا قرینہ ہے

دسمبر میں ہمارے خواب بھی روئی کے گالوں کی طرح
اُڑ کے فضا میں پھیل جاتے ہیں
دسمبر میں زمانے کے گزرنے کا
لہو کے سرد ہونے کا
عجب احساس ہوتا ہے

اُسے کہنا دسمبر جا رہا ہے تُم نہیں آئے
اُسے کہنا دسمبر جا چُکا تو پھر
نیا اک سال آئے گا
کسے معلوم اُس میں کون جیتا ہے؟

سید افسر ساجد

انتخاب

— خالد احمد —

نعمان منظور

اپنی تنہائی کے سائے سے لپٹ کر سو گئے
رکھ کے اپنے دل پہ تیرے غم کا پتھر سو گئے

مجھے کچھ دیر رُکنا ہے

مجھے کچھ دیر رُکنا ہے
سہولت ہو تو آجانا
بہت دن ہو گئے ہیں،
تمھیں دیکھے،
تمھارے پاس بیٹھے،
چائے پیتے، باتیں کرتے،
بولتے، ہنستے،
تمھاری کیف پرور مسکراہٹ
میں نکھرتے،
نیلی آنکھوں میں اُترتے،
ملائم لمس کی رو میں بکھرتے،
مہکتی اور مہکاتی گلابی گرم سانسوں
میں سنورتے
گیسوؤں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ٹھہرتے،
ہجوم شوق کی رہ سے گزرتے
بہت دن ہو گئے ہیں

مجھے کچھ دیر رُکنا ہے
پھر اس کے بعد اِک لمبے سفر
پہ لوٹ جانا ہے
نہیں معلوم
یہ آنکھیں تمھیں کب دیکھ پائیں گی
کبھی یہ دیکھ بھی پائیں گی،
یا پھر
گم شدہ افراد کے گہرے سمندر میں
اَبد تک ڈوب جائیں گی
کبھی واپس نہ آئیں گی

مجھے کچھ دیر رکنا ہے
سہولت ہو تو آجانا

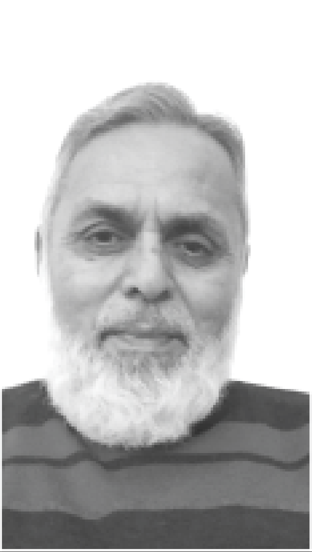

محمد انیس انصاری

زمانہ ایک حالت میں کبھی رہتا نہیں دائم

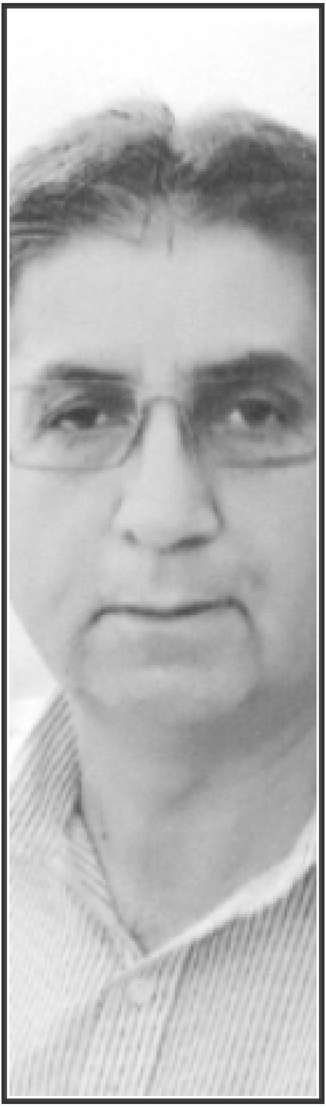

ادھر دیکھو!
بہت سرسبز شاخیں تھیں
یہاں شام و سحر چڑیاں چہکتی تھیں
کہیں پر گھونسلے تھے فاختاؤں کے
گھنے پیپل کا ہر اک پتا مہکتا تھا
پرندوں سے محبت تھی تو ان کا رنگ گہرا تھا
بہت گہرا
ہماری چاہتوں کا رنگ اس سے بھی کہیں گہرا تھا
ہم اس کے گھنیرے سبز سایوں میں تمہارے
ساتھ پہروں بیٹھے رہتے تھے
بسا اوقات لمبی لمبی باتیں کرتے جاتے تھے
کبھی ساون کی بارش میں یہ بوندیں جھاڑتی
شاخیں ہمیں جھولا جھلاتیں تو
دریچے ڈانٹنے لگتے
کواڑوں سے کسی کی خشمگیں آواز آتی تھی
ارے بیمار پڑ جاؤ گے کم بختو

تمہیں کچھ یاد بھی آیا؟
مگر اب یاد کرنے سے بھی کیا حاصل
زمانہ ایک حالت میں کبھی رہتا نہیں دائم
نہ تم اپنی جگہ باقی، نہ ہم اپنی جگہ قائم

طالب انصاری

محبت کا گمنامہ باغیچہ

چلتے
اُٹھتے بیٹھتے
سوتے جاگتے
تجربات کا ایک لشکر
میرے اندر جنگ جاری رکھتا ہے
تفکرات کے مفروضے
میرے گرد منڈلاتے ہیں
میں ان سے لڑتا ہوں
جھگڑتا ہوں
آخرکار
بے یقینی کی بنارسی فضا میں
آپہنچتا ہوں

آگے
خدشات کا لامتناہی سلسلہ
اُداسی کا سیلاب ہے
بے یقینی کے آسیب زدہ ممولے
درختوں کی شاخوں پر بیٹھے
مجھے گھورتے رہتے ہیں

مگر میں اب بھی
محبت کی تبلیغ میں مصروف ہوں
امن کا فلسفہ سمجھاتا ہوں
زندگی کے بطن سے
گمنام معانی نکالتا ہوں

اور تُم
دشت کی بیکراں وسعتوں میں
مسافتوں کے انبار لیے
کسے دیکھتی ہو
نجانے کیا ڈھونڈ رہی ہو؟

امجد بابر

زبانی جمع خرچ

مری تلاش میں نہ چل
کہ میں تو تیرے سامنے کی بات ہوں
تو میرا نام لے کے سحر پھونکتا ہے
میرے نام کی تہوں میں جھانکتا ہے
میرا راز جانتا ہے

تالیوں کی گُونج میں
ساتھیوں کے ہاتھ میں
مری زباں کے چیتھڑے
سُرخ سبز رنگ میں

تو اب مری زبان پہ اپنا نام لکھ
مری زباں پہ جھوٹ جھالریں سجا
اسے سکھا کہ جھوٹ سچ میں کوئی تفرقہ نہیں
اسے بتا کہ سچ وہی ہے جو تجھے عزیز ہے

مری تلاش میں نہ چل
مجھے مری زباں کی تلخیاں نہ دے
مری زبان میرے پاس آئے گی
تو وہ کہے گی جو مجھے عزیز ہے

فیاض تحسین

تیرے لیے

پہلی
غزل
کا
مطلع

شروع کی
نظم کا جلتا بھیتر

اک بے چین آغاز کے گیت کا
مکھڑا

رُوپہلی بارش کا چھینٹا

لوک سے کا
اک فِقرا کی
ہجر سمویا، مٹی رُلیا، درد کا ماہیا

"سائیں مرنا"
کا
اکتارا
راگ پہاڑی پہ چھیڑی دُھن

تیرے
لئے
ہے
غور سے سُن

ساحلی دھوپ کی قاشیں

سے
پہلو بدلتا
بائیں جانب کھڑا مسکاتا ہے

جس کی کوکھ سے
مچھلی
نکل کر تیرنے لگی ہے
مچھیرا مچھلی نے جنم دیا
کشتی نیا مانجھی

مسلسل دردِ زہ میں رہتی
آنکھ
سمندر پیدائش کرتی ہے

زیریں گھاؤ
رینگتی چیونٹیوں کا
بے چینی کی مسافت میں
رُوپہلی کائی کو چھونا چاہتا ہے

آبی پرندے
ہمکتے
چمکتی ریت کو دیکھنے کی خواہش میں
محبت کی ساحلی دھوپ کی قاشیں چوستے
جھلس جاتے ہیں

تنویر قاضی

محبت کے سائے میں چھپا اندھیرا (نثری نظم)

کبھی کبھی محبت بھی ایک عکس بن جاتی ہے،
جو سامنے ہو کر بھی اندر کی حقیقت نہیں دکھاتی۔
کچھ لوگ آپ سے محبت جتاتے ہیں،
ایسے جیسے آپ اُن کے دل کے سب سے قریب ہوں۔
وہ آپ کے ہر جملے میں مسکراہٹ ڈھونڈتے ہیں،
مگر اُن کی آنکھوں کے کسی پُرانے گوشے میں
ایک خاموش سا اندھیرا رہتا ہے
ایسا اندھیرا جو آپ کی روشنی برداشت نہیں کرتا۔
پھر جب خدا آپ کو عزت دیتا ہے،
تو وہ اندھیرا بے نقاب ہو جاتا ہے۔
ایک معمولی سی بات،
ایک بے ضرر سا جملہ،
اُن کے دل میں طوفان بن جاتا ہے۔
وہ آپ کے لفظوں کو ہتھیار بنا دیتے ہیں،
اور آپ کی خوشبو سے بھی خفا ہو جاتے ہیں۔
یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب آپ سمجھتے ہیں
بڑا ہونا عمر سے نہیں ہوتا ظرف سے ہوتا ہے۔
ایک کشادہ دل انسان
کبھی کسی دوسرے کی بلندی سے جلتا نہیں،
بلکہ اُس کی کامیابی میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔
وہ جانتا ہے کہ عزت بانٹنے سے گھٹتی نہیں،
بلکہ انسان کے اندر کا سکون بڑھاتی ہے۔
میں نے ایسے کئی لوگ دیکھے ہیں
جو تعریف کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گئے،
جن کی مسکراہٹوں میں رشک کی دراڑ تھی،
اور جن کے دل میرے صبر سے چھوٹے تھے۔
میں نے سیکھا ہے
کہ محبت اگر ظرف سے خالی ہو،
تو وہ دشمنی سے زیادہ تکلیف دیتی ہے۔
پھر میں نے خود سے کہا:
لوگوں کے رویوں کا بوجھ مت اٹھاؤ،
اپنی نیت کو سلام کرو،
اور اپنے رب کے فیصلے پر مطمئن رہو۔
کیونکہ آخرکار
عزت وہ نہیں جو زبانوں سے کہی جائے،
بلکہ وہ ہے جو دل کے اندر بس جائے۔
وہ عزت جو وقت کی دھول سے مٹتی نہیں،
اور جو کسی کے ظرف سے نہیں،
صرف خدا کے کرم سے ناپی جاتی ہے۔

سید فرخ رضا ترمذی

حیرانی

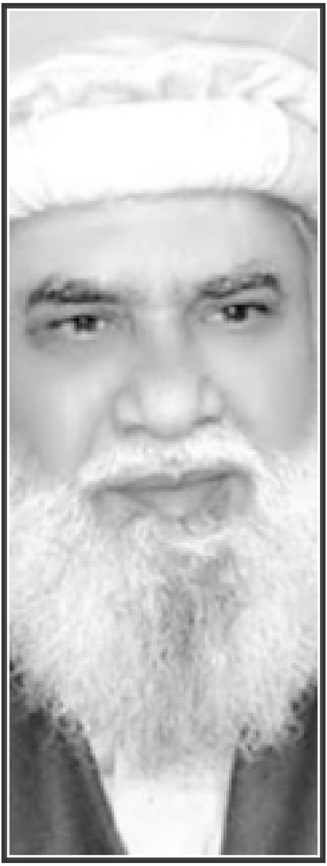

اکرم ناصر

میں حیران ہوا کرتا تھا

کیسے پڑھی لکھی اولاد

اپنے بوڑھے ماں اور باپ کو

اولڈ ہاؤس میں چھوڑ آتی ہے

لیکن اب حیران نہیں ہوں

اولڈ ہاؤس میں

حیرانی کے

داخلے پر پابندی ہے

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

قائدِ اعظمؒ

وہ کہ تھا بابائے ملت، قوم کا معمار تھا
ملتِ اسلامیہ کا کس قدر غم خوار تھا

کام، کام اور کام ہی سے کام رکھا عمر بھر
انگ انگ اُس کا عمل کے شوق میں سرشار تھا

کر دکھایا اُس نے تن تنہا زمانے کو وہ کام
جو ہزاروں اور لاکھوں کے لیے دشوار تھا

اے مسلماں قوم! اُس کی یاد سے غافل نہ ہو
تجھ پہ مرمٹنے کو تو وہ ہر گھڑی تیار تھا

دوستوں پر اُس کی اک اک سانس بھی قربان تھی
دشمنوں کے واسطے وہ آہنی تلوار تھا

آج ہم جس کے وطن میں مست ہیں، مدہوش ہیں
وہ تو جب دیکھو، سدا بیدار تھا، ہشیار تھا

"خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی"
اِس حقیقت کا دل و جاں سے اُسے اقرار تھا

ہم ہیں اُس کے دیس میں کاسہ بدست و در بہ در
دوستو! وہ تو بڑا غیور تھا، خوددار تھا

ہر فرنگی اُس کے آگے عاجز و قاصر ہوا
ہر برہمن اُس کے آگے بے بس و لاچار تھا

وہ تعصب اور عصبیت کا قائل ہی نہ تھا
وہ تو فرقہ بندیوں سے بھی بہت بیزار تھا

منزلِ مقصود پر جا کر ہی اُس نے دم لیا
کاروانِ حریت کا قافلہ سالار تھا

محسنِ ملت کہوں یا قائدِ اعظم اُسے
وہ بہ ہر صورت مشیت کا حسیں شہکار تھا

میرے قائد کی فقط گفتار ہی دلکش نہ تھی
سیرت و کردار میں بھی وہ گلِ بے خار تھا

ناتواں کندھوں پہ جب اُس نے اٹھایا بارِ قوم
کیوں نہ پھر فیضان اُس کو مانیے معمارِ قوم

اتحادِ قوم، تنظیم و یقینِ لازوال
اِن سے اُس کو اپنی جاں سے بھی زیادہ پیار تھا

فیض رسول فیضان

نثری نظم

نائلہ راٹھور

محبت خانہ بدوش ہے"
ہم اپنی ذات میں کتنے اکیلے ہیں
خوابوں کی سرزمیں بانجھ ہو چکی ہے
آنکھیں بنجر ہیں
انتظار کبھی ختم نہیں ہوتا
ہم کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر
سب سے دور ہوتے جاتے ہیں
شائد ہمارا چہرہ اپنی ہیئت بدل چکا ہے
کسی آنکھ میں پہچان باقی نہیں
محبت خانہ بدوش ہے
کسی ایک جگہ نہیں رکتی
دل سے یادیں ہجرت کر جائیں تو
وجود کو بے حسی گھیر لیتی ہے
شناسا چہروں میں
پہچان ڈھونڈتے ہیں
نظر اندازی کا گھاؤ کبھی نہیں بھرتا
وقت کے ساتھ
لوگ آپکی محبت کو abondend
کر دیتے ہیں
ہم
بنا محبت کے
جینا سیکھ جاتے ہیں

☆☆☆☆☆

مجھے پڑھنا نہیں آتا

فقط کچھ حرف آتے ہیں
فقط کچھ لفظ آتے ہیں
دو اک اشعار ازبر ہیں
دو اک اشخاص کے مطلب
دو اک اشخاص کے بارے میں معلومات ازبر ہیں
دو اک آیات آتی ہیں
دو اک آیات کا اک خام سا مفہوم آتا ہے
انہی محدود سی، ناقص سی معلومات کے باعث
مرے احباب مجھ کو صاحبِ ادراک کہتے ہیں
حقیقت پوچھتے ہو تو
حقیقت صرف اتنی ہے
مجھے پڑھنا نہیں آتا
غلط ہی پڑھتا جاتا ہوں
وہ آنکھوں کی اشارت ہو
وہ چہروں کی عبارت ہو
وہ سوچوں کی بجھارت ہو
غلط ہی پڑھتا جاتا ہوں
جو میرے زیر سایہ ہیں اسے بھی ٹھیک کہتے ہیں
کہ میرے زیر سایہ ہی
جو مجھ سے پیار کرتے ہیں
انھیں تو میری کج فہمی پہ بھی بس پیار آتا ہے
حقیقت پوچھتے ہو تو مجھے پڑھنا نہیں آتا
کبھی لفظِ ضرورت کو محبت پڑھنے لگتا ہوں
محبت کو عموماً میں شرارت پڑھنے لگتا ہوں
کبھی سجدوں کی عادت کو عبادت پڑھنے لگتا ہوں
دکھاوے کی سجاوٹ کو طہارت پڑھنے لگتا ہوں
کبھی تو آزمائش کو بھی نعمت پڑھنے لگتا ہوں
میں بچپن ہی سے پڑھنے میں ذرا ناکام ٹھہرا ہوں
نصیحت کو میں بچپن میں بھی نفرت سمجھا کرتا تھا
مگر اب جب کہ چاندی میرے بالوں سے ہویدا ہے
غلط پڑھتے ہوئے مجھ کو ذرا اب شرم آتی ہے
سو اب جو کچھ بھی پڑھتا ہوں وہ خاموشی سے پڑھتا ہوں
بہت کم بولتا ہوں میں
میری کم گوئی کو بھی لوگ حکمت ہی سمجھتے ہیں
تو گویا ان کو بھی میری طرح پڑھنا نہیں آتا
مگر اک خوف دامن گیر رہتا ہے سدا مجھ کو

علمدار حسین

کہ میرے جہل سے کوئی یہاں واقف نہ ہو جائے
مرے مولا، مرے مولا!
نہ پڑھ پانے کے باعث کب تلک میں دھوکے
کھاؤں گا
مجھے آثار سے سچائیاں معلوم کرنی ہیں
مجھے آیات کے مفہوم کی تہہ میں اُترنا ہے
مجھے غاروں میں کھوئی صورتوں کو ڈھونڈنا بھی ہے
مجھے موجود، لاموجود کی خبریں نہیں دیا
میں اپنے چارسو پھیلی ہوئی آئندہ کی خبریں
نہ پڑھ پایا تو کیا ہوگا؟
مُجھے اقرا کی آیت کی اگر تفسیر مل جائے
دعائے ربی زدنی کو اگر تاثیر مل جائے
مری بے نور آنکھوں میں جو پڑھ پانے کا سپنا ہے
اُسے جو بابِ شہرِ علم سے تعبیر مل جائے
مجھے توقیر مل جائے
مرے مولا! مرے مولا!
مجھے پڑھنا نہیں آتا
مجھے پڑھنا نہیں آتا

وقت کا دریا

وقت ایک دریا ہے جو کبھی رکتا نہیں
نہ کسی تاج کی حرمت دیکھتا ہے
نہ کسی تخت کی عظمت پہ ٹھہرتا ہے
وہ بہتا ہے، چپ چاپ،
جیسے صدیوں کے راز اپنے اندر چھپائے ہوئے ہو

وقت کے اس دریا نے بہت کچھ دیکھا ہے
اس نے پتھروں سے انسان بنتے دیکھے
اور انسانوں سے بت
اس نے خوابوں کو سلطنتوں میں ڈھلتے دیکھا
اور سلطنتوں کو خواب بنتے دیکھا

یہ دریا کبھی نرمی سے بہا
جب انسان نے محبت کے بیج بوئے
جب قلم نے تلوار کو شکست دی
جب الفاظ نے زخموں پر مرہم رکھا
جب ایک دعا نے ہزاروں فاصلے مٹا دیے

اور یہی دریا کبھی طوفان بن گیا
جب انسان نے زمین بانٹ لی
جب طاقت نے دلوں کی جگہ لے لی
جب خون پانی سے سستا ہو گیا
جب انصاف کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی

وقت کا دریا سب کچھ بہا لے گیا
فرعون کے اہرام، قیصر کے محلات
کسریٰ کی سلطنتیں، سکندر کی جیتیں
سب موجوں میں گم ہو گئیں
صرف نام رہ گئے — اور وہ بھی مٹنے لگے

دریا نے ان ماؤں کے آنسو بھی دیکھے
جو اپنے بیٹوں کی لاشیں ڈھونڈتی رہیں
اس نے ان سپاہیوں کے خواب بھی بہا دیے
جو فتح کے نشے میں انسانیت ہار گئے
اور اس نے ان فقیرانہ مسکراہٹوں کو بھی یاد رکھا
جو شکست کے باوجود شکر ادا کرتی رہیں

وقت کبھی کسی کے لیے نہیں رکا
وہ بادشاہوں کے قدموں پر نہیں جھکا
وہ فاتحوں کے نام سے متاثر نہیں ہوا
اس نے صرف سچ کو زندہ رکھا
اور جھوٹ کو اپنی لہروں میں دفنا دیا

وقت نے ہر دور میں انسان کو آئینہ دکھایا
مگر انسان نے دیکھنے سے انکار کیا
وہ ماضی کے ملبے میں فخر ڈھونڈتا رہا
اور مستقبل کے اندھیرے میں راستہ کھو بیٹھا

اے وقت کے مسافر!
تو دریا کے کنارے کھڑا ہے
تیری مٹھی میں کچھ نہیں،
مگر تیرے دل میں سب کچھ ہے
اگر تو چاہے تو تاریخ بدل سکتی ہے
اگر تو دیکھ لے کہ بہاؤ تیرے اندر بھی ہے

وقت کا دریا کبھی تھمتا نہیں
مگر کبھی کبھی وہ رک کر سنتا ہے
کسی بچے کی ہنسی
کسی مظلوم کی دعا
کسی ماں کی آہ
کسی شاعر کی صدا

یہی وہ لمحے ہیں
جب وقت خود کو یاد کرتا ہے
کہ اس کے ہونے کا مطلب
تب ہی ہے جب انسان زندہ ہو
جب دل دھڑک رہا ہو
اور محبت ابھی باقی ہو

تو سن اے انسان،
یہ دریا تجھے بلاتا ہے
کہ بہاؤ کے ساتھ مت بہہ
کبھی اُس کے خلاف بھی چل
اور ثابت کر کہ
تو صرف تاریخ کا حصہ نہیں
تاریخ کا معنی ہے

کیونکہ وقت کا دریا
سب کچھ بہا دیتا ہے
سوائے ان کے
جو سچ کے کنارے کھڑے رہتے ہیں
جنہوں نے ظلم کے موسم میں بھی
انصاف کا چراغ جلایا
اور جنہوں نے یہ کہہ کر دنیا کو بدل دیا
کہ وقت ہم سے نہیں بنتا،
ہم وقت بناتے ہیں

لبنیٰ صفدر

یادیں

سید طاہر شیرازی

برکھا رُت نے یاد دلائیں
پھر سے یادیں بچپن کیں

بارش میں یوں ننگے پاؤں
گلیوں میں بس بھاگتے رہنا

کھیلتے رہنا ہنستے رہنا
کیچڑ میں یوں لت پت ہو کر

اک دوجے کو چھیڑتے رہنا
ہنستے رہنا ہنستے رہنا

کیسے تھے وہ اچھے موسم
کیسی تھی وہ رُت مستانی

بے فکری کے طاہر لمحے
آج وہ پھر سے یاد آئے ہیں

وقت کے صحرا میں جب میں نے
خود کو تنہا پایا ہے

خود کو تنہا پایا ہے
خود کو تنہا پایا ہے

رسم

اب کہ ان موسموں میں جانے کیوں؟
من میں بارش ہے ایک تھم سی گئی
اور ------ ایک نادیدہ
یخ اُداسی ہے دل کو گھیرے ہوئے
گھاٹیاں لاشعور کی ساری
فکر اور سوچ کی ہر اک چوٹی
کہر، ماضی کی اب کے لپٹی ہے
خواہشیں جو کہ ناتمام رہیں
وہ وفائیں جو کچھ بھی دے نہ سکیں
آ کے ان خواہشوں، وفاؤں کو
آنکھ کی وسعتوں سے دور کہیں
رسمِ حالات کا کفن دے کر
سوچ تھی پھیلتی سی دھند میں ہم
------ آؤ مل جل کے اس کو دفنا دیں

منیب سلطان بیا

--------------- انتخاب ---------------

- خالد احمد -

------- نعمان منظور -------

مرے نفس سے دمِ عندلیب شرمائے
مگر چمن میں مری کوئی شاخسار تو ہو

تو پھر ایسا ہونا تھا..........

ساری دنیا کے فرعونوں، نمرودوں اور
قارونوں کو
پیچھے چھوڑ کے جب ہم نے
انسانوں کی کچی پکی فصلوں کو
بے دردی سے برباد کیا
دنیا کو تاراج کیا
اپنی انا کی خاطر ہم نے
ابنِ آدم کو طبقات کی بارودی چکی میں رکھ کر
بھسم کیا ضعف سے تھر تھر کانپتے
لوگوں کو طاقت کے بھاری تیشے سے
ابدی نیند سلا کر ہم نے جشن منایا
کتنے بچے اپنی مردہ ماؤں کی چھاتی سے لگ کر
ہمک ہمک کر خاک ہوئے
شام، عراق، فلسطین اور کشمیر کی ماؤں،
بہنوں سے پوچھو یاد ہے تم کو
شام کے ننھے بچے نے
بلک بلک کر روتے ہوئے دنیا سے کہا تھا
میں اللہ میاں سے شکوہ کروں گا
اللہ میاں کے دفتر میں اب اس نے شکایت
کر ڈالی ہے
اور سارے مظلوموں نے اس کی شکایت
پر آمین کہا ہے
یاد رکھو یہ داد رسی ہے
جب ایسا ہے
تو پھر ایسا ہونا تھا

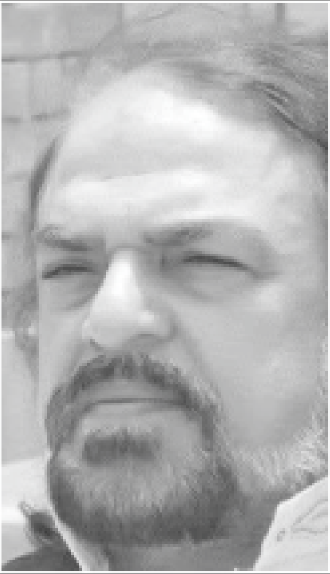

احمد ساقی

اثاثہ [نثری نظم]

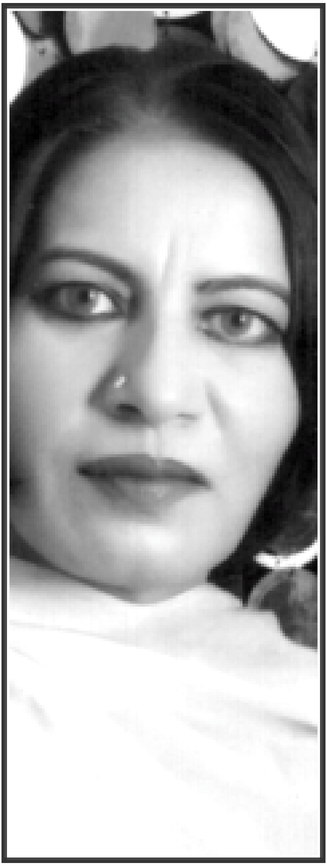

تم جو کہو تو
بھول سکتی ہوں میں
وہ ساری باتیں
وہ ساری قسمیں
وہ سارے وعدے
وہ سارے خواب

جو میرے دل میں
تیری میری
چاہت _ اور
محبت کا
اثاثہ ہیں

نگہت اکرم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

بہت اچھے لگتے ہیں

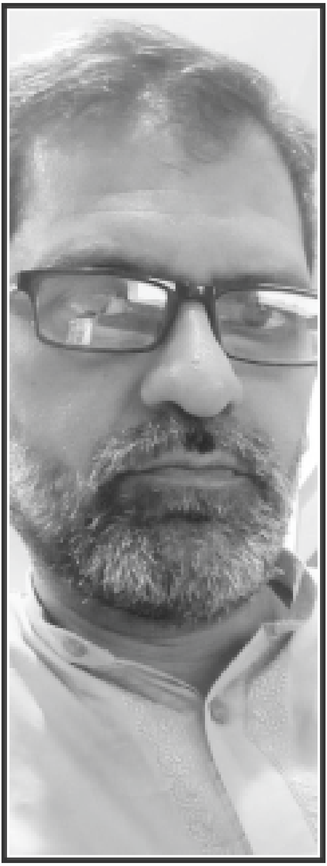

محمد عبداللہ

سخن شناس
دلدادہ، شیدا ہوتے ہیں
بولیں تو
پھول جھڑتے ہیں
بہت اچھے لگتے ہیں

خوش گفتار سے
اپنے اظہارِ بیان سے
سامنے والوں کو
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے
محبت پر آمادہ کر لیتے ہیں
بہت اچھے لگتے ہیں

سینکڑوں، ہزاروں
بل کہ لاکھوں روپ میں
سامنے آتے ہیں
بہت اچھے لگتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنا نہ سکا، تیرے بتائے ہوئے رستے
لیکن ترے مانند کسی کا نہ ہوا میں

سرما [نثری نظم]

اب کے برس سرما شدت پہ ہے
سردی اب کے آسمان سے اُتر کے میری رگوں میں ٹھہری ہے
آنکھ میں آنسو جم رہے ہیں
آتی جاتی سانس کی لہریں
اس سرما میں برف کی گرمیوں میں ڈھل کر
سانس کی نالی چیر رہی ہیں
گرما کے موسم کے کپڑے جب سمیٹ کے الماری سے باہر رکھے
ان میں تمھارے کپڑے نہیں ہیں
سرما کے کپڑوں سے جب الماری بھری تو
اس میں تمھارے کپڑے نہیں ہیں
جاڑا اب کے میرے استخوانی ہاتھوں سے گزر کر
ہماری الماری کے درازوں تک پہنچ گیا ہے
جہاں صرف میری جرابیں ہیں
گرم کوٹ اور مفلر ہیں
اب کے جاڑا شدت پہ ہے
آنکھ میں آنسو جم گئے ہیں
شام کی نوکیلی شاخیں میری رگوں میں اُتر گئی ہیں
سانس کی ڈوری برف کی کرچی سے کٹ رہی ہے

بشریٰ شیریں

نظم
[نذرِ عاشق جعفری]

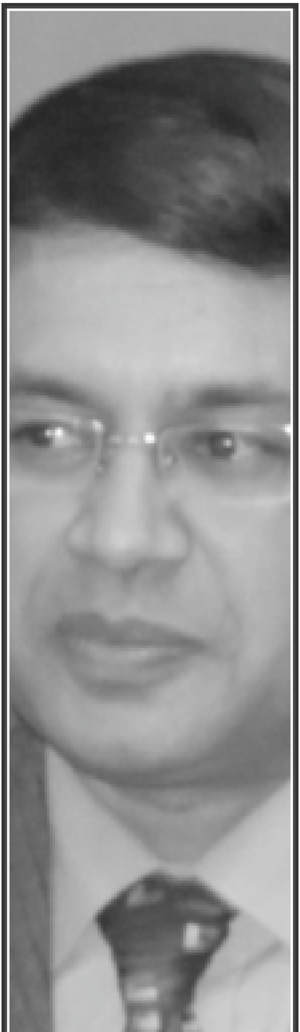

جُنید آذر

تم سے یہ کہا کس نے

"راستے پرائے ہیں"

راستے تو اُن کے ہیں ——— جو قدم اُٹھاتے ہیں

منزلِ سخن بڑھ کر ——— تیرے پاؤں چومے گی

حرف و صوت کا رشتہ ——— ٹوٹ ہی نہیں سکتا

تُو نے اپنے لفظوں سے ——— زندگی کے موسم کو

رنگ کچھ نئے دے کر ——— منظروں کی کھڑکی میں

پیار سے سجایا ہے

دوستوں کی محفل میں ——— ذکر ہے ترے فن کا

چاہے وہ "ترابی" ہو، ——— یا جنید آذر ہو

ہم قدم تمھارے ہیں

تم قدم بڑھاؤ تو ——— راستے پکاریں گے

راستے تمھارے ہیں

اور صدا نہ آئے گی

"راستے پرائے ہیں"

جیسے تم پیار کرتے ہو
خالد میر

دکھ تے بیٹھا پنچھی اڈریا ہویا اے

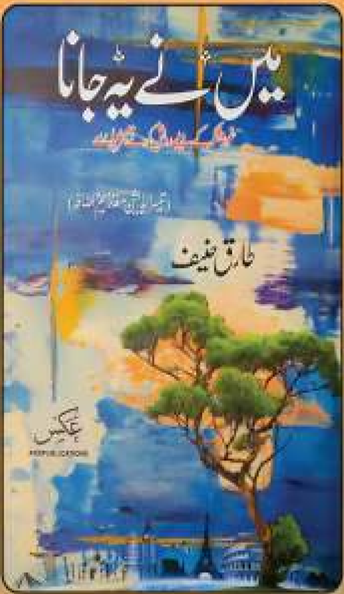
میں نے یہ جانا
طارق حنیف

شاھد و مشھود
رانا محمد شاھد

ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
پہلی صدا پرندے کی
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد